مهجور خدا

از محمد حنیف

فَسُبۡحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيۡءٍ وَإِلَيۡهِ تُرۡجَعُون

پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے، اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے

اعتراف

فہم قرآن کے حوالے سے یہ انسانی کوشش ہے۔ جو سہو و خطا سے منزہ نہیں ہو سکتی۔ تفکر و تدبر دین کے ضمن میں اگر میرا نقطہ نظر درست ہے، تو یہ اس رب کریم کی بے پایاں نوازشات و عنایات کی وجہ سے ہے۔ اگر کہیں مجھ سے کوتاہی سرزد ہوئی ہے، تو یہ میرا انسانی سہو ہے۔ جسکے لیے میں اپنے رب کے حضور رحمت و مغفرت کا طالب ہوں۔ وہ یقیناً انسان کی نیتوں سے واقف ہے۔

إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون

انسانی فہم صدیوں سے اس سوال کا جواب پانے میں ناکام ہے کہ وہ بلند و بالا ہستی، جسے کوئی خدا کے نام سے جانتا ہے، کوئی گاڈ کہہ کر پکارتا ہے، کوئی بھگوان کہتا ہے، اور کوئی اللہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔۔۔

وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ اسے کس نے بنایا؟؟

اس کی کنہ و ماہیت کیا ہے؟ اس کی شکل و صورت کیسی ہے؟ اس کی جنس کیا ہے؟

یہ سچائی، زمان و مکاں کے دائرے میں قید اس انسان کے حیطہ ادراک سے ماوراء ہے کہ کوئی ایسی ہستی بھی ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

سچ تو یہ ہے کہ ایک محدود ذہن، کسی لا محدود کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اس رب کائنات نے، اپنے بندوں سے صرف ایمان کا مطالبہ کیا ہے، ادراک کا نہیں، اس نے اپنی ذات کے حوالے سے چند اشارات پر ہی اکتفا کیا۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔۔

اللَّهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ ۖ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ ۖ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِن شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ

تَمۡسَسۡهُ نَارٌ ۚ نُّورٌ عَلَىٰ نُورٍ ۗ يَهۡدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَيَضۡرِبُ اللَّهُ الۡأَمۡثَالَ لِلنَّاسِ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمٌ [٢٤:٣٥]

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے، (اِس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں) اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے
[ابو الاعلی مودودی]

اس کی ذات نہ انسانی عقل و فکر میں سما سکتی ہے، اور نہ ہی اسے کسی مثال سے سمجھایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا۔۔

فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَالۡأَرۡضِ ۚ جَعَلَ لَكُم مِّنۡ أَنفُسِكُمۡ أَزۡوَاجًا وَمِنَ الۡأَنۡعَامِ أَزۡوَاجًا ۖ يَذۡرَؤُكُمۡ فِيهِ ۚ لَيۡسَ كَمِثۡلِهِ شَيۡءٌ ۖ وَهُوَ السَّمِيعُ الۡبَصِيرُ [٤٢:١١]

آسمانوں اور زمین کا بنانے والا، جس نے تمہاری اپنی جنس سے تمہارے لیے جوڑے پیدا کیے، اور اسی طرح جانوروں میں بھی (اُنہی کے ہم جنس) جوڑے بنائے، اور اِس طریقہ سے وہ تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے [ابو الاعلی مودودی]

نہ صرف یہ کہ وہ کسی مثال سے سمجھایا نہیں جا سکتا، بلکہ کوئی آنکھ اسے دیکھ بھی نہیں سکتی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔۔

لَّا تُدۡرِكُهُ ٱلۡأَبۡصَٰرُ وَهُوَ يُدۡرِكُ ٱلۡأَبۡصَٰرَۖ وَهُوَ ٱللَّطِيفُ ٱلۡخَبِيرُ [٦:١٠٣]

نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے، وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے [ابوالاعلی مودودی]

اور پھر اس کی ذات کو، اس کی ہستی کو ایسے حسین پیرائے میں بیان فرمادیا کہ جسے پڑھ کر روح وجد میں آ جاتی ہے۔ فرمایا۔۔

قُلۡ هُوَ ٱللَّهُ أَحَدٌ [:]ٱللَّهُ ٱلصَّمَدُ [:]لَمۡ يَلِدۡ وَلَمۡ يُولَدۡ [:]وَلَمۡ يَكُن لَّهُۥ كُفُوًا أَحَدُۢ [١١٢:٤]

(اے نبئ مکرّم!) آپ فرمادیجئے: وہ اللہ ہے جو یکتا ہے، اللہ سب سے بے نیاز، سب کی پناہ اور سب پر فائق ہے، نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ ہی وہ پیدا کیا گیا ہے، اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے، [طاہر القادری]

خدا کی دنیا

وہ رب جو اپنی ذات کے حوالے سے اپنے بندوں سے صرف ایمان کا مطالبہ کرتا ہے، اسے علم تھا کہ، اس کے بندے اس کو جاننا چاہیں گے، سمجھنا چاہیں گے۔ چنانچہ اس نے اپنی ذات کو ان صفات کے ذریعے متعارف کروایا جو اس ساری کائنات میں جاری وساری ہیں۔ رحمٰن، رحیم، خالق، مالک، ستار، غفار، رزاق، عزیز، حکیم، جبار، قہار۔۔

اس نے ہمیں بتایا کہ وہ اپنی یکتا ذات میں، اپنی مرضی کے مطابق، اپنی دنیا میں، جو چاہتا ہے کرتا ہے اپنے حکم کی تعمیل کے لیے وہ کسی کا محتاج نہیں۔

طاقت، قوت، غلبہ، اقتدار، اختیار، گرفت، قدرت اپنی انتہائی شکل میں اس ہی کی ذات کا خاصہ ہیں، جسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ اس ہی کو " العزیز " کہتے ہیں۔

لیکن وہ خدا ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اس کی یہ طاقت، غلبہ، اقتدار کوئی اندھی قوت نہیں ہے بلکہ وہ اپنی صفت " الحکیم " کی بناء پر اصول، ضابطے اور عدل کی بنیاد پر مستحکم ہے۔ خدا کی یہ دنیا " عالم امر " کہلاتی ہے

عالم امر

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ [٧:٥٤]

بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین (کی کائنات) کو چھ مدتوں (یعنی چھ اَدوار) میں پیدا فرمایا پھر (اپنی شان کے مطابق) عرش پر استواء (یعنی اس کائنات میں اپنے حکم واقتدار کے نظام کا اجراء) فرمایا۔ وہی رات سے دن کو ڈھانک دیتا ہے (درآنحالیکہ دن رات میں سے) ہر ایک دوسرے کے تعاقب میں تیزی سے لگا رہتا ہے اور سورج اور چاند اور ستارے (سب) اسی کے حکم (سے ایک نظام) کے پابند بنا دیئے گئے ہیں۔ خبردار! (ہر چیز کی) تخلیق اور حکم و تدبیر کا نظام چلانا اسی کا کام ہے۔ اللہ بڑی برکت والا ہے جو تمام جہانوں کی (تدریجاً) پرورش فرمانے والا ہے،

[طاہر القادری]

خدا کی یہ دنیا، جسے وہ "عالم امر" کہتا ہے، دراصل اس کی مثال اس طرح ہے، جیسے کسی ریاست کا صدر مقام ہوتا ہے۔ وہ مقام جہاں وہ رب اپنی مرضی و منشاء سے، جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔

(اس مقام پر میں اس بات کی وضاحت پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ خدا زمان و مکاں کی حدود اور خیال و گمان سے برتر و بالا ہے، پاک ہے۔ چنانچہ یہ اصطلاح "صدر مقام" محض عام سمجھنے کے نظریہ سے استعمال کی جارہی ہے۔ اس کا معنی یہ ہرگز نہیں ہے کہ معاذ اللہ، وہ رب کسی ایک جگہ پر محدود ہے)

چنانچہ ارشاد فرمایا۔۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۖ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۖ مَا مِن شَفِيعٍ إِلَّا مِن بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ [۱۰:۳]

یقیناً تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین (کی بالائی و زیریں کائنات) کو چھ دنوں (یعنی چھ مدتوں یا مرحلوں) میں (تدریجاً) پیدا فرمایا پھر وہ عرش پر (اپنے اقتدار کے ساتھ) جلوہ افروز ہوا (یعنی تخلیقِ کائنات کے بعد اس کے تمام عوالم اور اَجرام میں اپنے قانون اور نظام کے اجراء کی صورت میں متمکن ہوا) وہی ہر کام کی تدبیر فرماتا ہے (یعنی ہر چیز کو ایک نظام کے تحت چلاتا ہے۔ اس کے حضور) اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے والا نہیں، یہی (عظمت و قدرت والا) اللہ تمہارا رب ہے، سو تم اسی کی عبادت کرو، پس کیا تم (قبولِ نصیحت کے لئے) غور نہیں کرتے، [طاہر القادری]

وہ رب اپنے اس صدر مقام میں اپنی سلطنت کے متعلق سارے فیصلے اور تدابیر اپنی مرضی و منشاء سے طے کرتا ہے اور اس کے لیے نہ تو وہ کسی کی مشاورت کا محتاج ہے، اور نہ ہی اپنے فیصلوں پر عملدرآمد کے لیے کسی کی معاونت کا۔ اس کا علم کائنات کی ہر شیئ پر محیط ہے۔ کائنات کی کوئی شیئ اس کے حیطہ ادراک سے ماورا نہیں۔ نہ ہی اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا۔۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۖ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ [٥٧:٤]

وہی ہے جِس نے آسمانوں اور زمین کو چھ اَدوار میں پیدا فرمایا پھر کائنات کی مسندِ اقتدار پر جلوہ افروز ہوا (یعنی پوری کائنات کو اپنے امر کے ساتھ منظم فرمایا)، وہ جانتا ہے جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس میں سے خارج ہوتا ہے اور جو کچھ آسمانی کرّوں سے اترتا (یا نکلتا) ہے یا جو کچھ ان میں چڑھتا (یا داخل ہوتا) ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے تم جہاں کہیں بھی ہو، اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو (اسے) خوب دیکھنے والا ہے، [طاہر القادری]

اُس رب کریم نے اپنی حکمت بالغہ سے، بغیر کسی کی معاونت و سابقہ مسالہ کے، اپنی مرضی و منشاء سے یہ سارا کارگہ حیات، اس میں موجود اشیاء کائنات، اس میں موجود ساری مخلوق، کو پیدا کیا۔ اس میں اپنی مرضی کے رنگ بھرے۔

اس نے اپنی مرضی سے یہ فیصلہ کیا کہ یہ کائنات کیسی ہونی چاہیے۔ اس نے اپنی مرضی سے یہ فیصلہ کیا کہ سورج کو روشنی اور گرمی دینی چاہیے۔ روزانہ مشرق سے طلوع ہونا چاہیے اور مغرب میں غروب ہونا چاہیے۔ اس نے اپنی مرضی سے فیصلہ کیا کہ نیم کو کڑوا ہونا چاہیے، شہد کو میٹھا ہونا چاہیے، نمک کو نمکین ہونا چاہیے۔ انسان کو دو پاؤں پر چلنا چاہیے، پرندوں کو ہواؤں میں اڑنا چاہیے، حشرات الارض کو رینگنا چاہیے۔

غرض اس نے اپنے اختیار و اقتدار کے غلبہ، قدرت کاملہ، اور حکمت بالغہ سے جو چاہا، جیسا چاہا، اور جب تک کے لیے چاہا، بنایا۔

چنانچہ ارشاد فرمایا۔۔

بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ [۲:۱۱۷]

وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جس بات کا وہ فیصلہ کرتا ہے، اس کے لیے بس یہ حکم دیتا ہے کہ "ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے [ابوالاعلی مودودی]

اپنے اقتدار اور ارادے کے غلبے کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا۔۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَن يَقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ [:]فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ [۳٦:۸۳]

وہ تو جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔۔پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے، اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے [ابوالاعلی مودودی]

مزید ارشاد فرمایا۔۔

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مَن يَمُوتُ ۚ بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ [:] لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ [:] إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ [١٦:٤٠]

یہ لوگ اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ "اللہ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہ اٹھائے گا" اٹھائے گا کیوں نہیں، یہ تو ایک وعدہ ہے جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔۔ اور ایسا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ اِن کے سامنے اُس حقیقت کو کھول دے جس کے بارے میں یہ اختلاف کر رہے ہیں اور منکرین حق کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے تھے۔۔(رہا اس کا امکان تو) ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے اس سے زیادہ کچھ کرنا نہیں ہوتا کہ اسے حکم دیں "ہو جا" اور بس وہ ہو جاتی ہے

[ابوالاعلی مودودی]

وہ اپنے ارادوں، فیصلوں کے لیے مکمل طور پر با اختیار ہے۔ جیسا چاہتا ہے کرتا ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا۔۔

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ [:.]خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ [۱۱:۱۰۷]

جو بد بخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے (جہاں گرمی اور پیاس کی شدت سے) وہ ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے ۔۔ اور اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں، الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے [ابوالا علی مودودی]

چنانچہ خدا کا "عالم امر" وہ مقام ہے، جہاں وہ رب کریم ازل سے موجود ہے اور ابد تک رہے گا۔ جہاں اس کا ارادہ ہی اس کا قانون ہے۔ وہ جو چاہے کرے، اس سے اس کا سوال نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس سے یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ نیم کڑوا کیوں ہے، شہد میٹھا کیوں ہے ؟؟

چنانچہ ارشاد فرمایا۔۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ [:]لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ [۲۱:۲۳]

اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دُوسرے خدا بھی ہوتے تو (زمین اور آسمان) دونوں کا نظام بگڑ جاتا پس پاک ہے اللہ ربّ العرش اُن باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔۔ وہ اپنے کاموں کے لیے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں [ابوالا علی مودودی

چنانچہ وہ رب بزرگ وبرتر، اپنی سلطنت میں، جو چاہے کرے، جس طرح چاہے کرے، اس کے اختیار پر نہ تو کوئی قدغن ہے، نہ ہی وہ کسی کا پابند۔ وہ اپنے ارادوں اور فیصلوں کا کلی مختار ہے۔ ہمیشہ سے تھا، ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔

عالم خلق

عالم امر میں کئے گئے فیصلوں کے مطابق، اس نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ آسمان پر چمکتا اور گرمی فراہم کرتا ہوا سورج، رات کو حسین بناتا چاند، اونچے اونچے پہاڑ، بلندی سے گرتے جھرنے، خوبصورت باغات اور اس میں انواع اقسام کی مخلوق، اور ان مخلوقات کا سردار حضرت انسان۔ اور پھر اس انسان کی راہنمائی کے لیے انبیاء کرام علیہ سلام کے ذریعے ابدی ہدایت۔

لیکن کیا یہ کائنات ہی واحد کائنات ہے؟

کیا یہ مخلوق جسے ہم دیکھ سکتے ہیں، یا جو ہمارے ارد گرد موجود ہے اس کے علاوہ کوئی اور مخلوق نہیں ہے؟

کیا وہ خدا ہماری اس کائنات کو تخلیق فرما کر ایک طرف ہو گیا ہے؟

کائنات میں علت و معلول کا نظام قائم کر کے معاذ اللہ ایک "عضو معطل" ہو کر رہ گیا ہے؟

آیئے یہ ہی سوال قرآن کریم سے کرتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا أُولِي أَجْنِحَةٍ مَّثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۚ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ [۳۵:۱]

تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین کا بنانے والا اور فرشتوں کو پیغام رساں مقرر کرنے والا ہے، (ایسے فرشتے) جن کے دو دو اور تین تین اور چار چار بازو ہیں وہ اپنی مخلوق کی ساخت میں جیسا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے [ابو الاعلی مودودی]

نہ صرف یہ کہ اپنی مخلوق میں اضافہ کرتا رہتا ہے بلکہ کہا کہ، نہ تو تمہاری یہ دنیا، ساری کائنات ہے۔ نہ ہی تمہاری دنیا میں موجود مخلوق، ہی اس کائنات کی واحد مخلوق ہے۔ بلکہ اس رب نے یہ سارا سلسلہ ارض و سماء اپنی مرضی، اور قدرت سے پیدا فرمایا۔ اور ان ارض و سمٰوات میں، اپنی مرضی و منشاء کی دیگر مخلوقات بھی تخلیق فرمائیں۔ اور جب اس کی مرضی ہو گی وہ ان مخلوقات کو آپس میں ملا بھی سکتا ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا۔۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِن دَابَّةٍ ۚ وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ

[٤٢:٢٩]

اُس کی نشانیوں میں سے ہے یہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش، اور یہ جاندار مخلوقات جو اُس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں وہ جب چاہے انہیں اکٹھا کر سکتا ہے [ابو الاعلی مودودی]

اور اپنی مخلوق کے حوالے سے وہ اپنی مرضی اور منشاء سے جیسا چاہتا ہے، فیصلے کرتا رہتا ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا۔۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا [٦٥:١٢]

خدا ہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ایسی ہی زمینیں۔ ان میں (خدا کے) حکم اُترتے رہتے ہیں تاکہ تم لوگ جان لو کہ خدا چیز پر قادر ہے۔ اور یہ کہ خدا اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے [فتح محمد جالندہری]

آیت بالا میں لفظ "يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ" اس تصور کی جڑ ہی کاٹ دیتا ہے کہ وہ رب اپنی مخلوق کو پیدا فرما کے، علت و معلول کا قانون نافذ کر کے، اب ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے، وہ خدا اب اس میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کرتا۔ یہ لفظ "يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ" ۔۔ فعل مضارع ہے، جو حال اور مستقبل پر محیط ہوتا ہے۔ آیت بالا، اس امر پر قول فیصل ہے کہ اللہ کریم اپنی مخلوق پر مکمل اختیار رکھتے ہیں، اور جہاں بھی ضروری ہو، اپنے فیصلے صادر کرتے ہیں۔ یہ عمل مسلسل ہو رہا ہے، اور مسلسل ہوتا رہے گا۔

قرآن کریم کی اتنی واضح آیات کی موجودگی میں، ہمارے چند محترم اکابرین نے اس سے بلکل متضاد عقائد اختیار کیے۔ اس دنیا میں ہونے والے ہر واقعہ کو "علت و معلول" کے دائرے کا قیدی بنا دیا۔ اس خدا کو جس کی صفت "علیم و خبیر"، "لطیف و بصیر"، "رحمٰن و رحیم" ہے، اپنی اس کائنات اور اس میں بسنے والی

مخلوق اور اس کے اعمال کے حوالے سے بلکل لاتعلق قرار دے دیا۔ اسے اپنے بنائے ہوئے نام نہاد قوانین کا اسیر بنادیا۔ عضو معطل بنا کر ایک طرف رکھ دیا۔ خاموش تماشائی بنادیا۔

ان محترم اکابرین میں سر فہرست نام جناب غلام احمد پرویزؒ کا ہے۔

اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب پرویزؒ لکھتے ہیں۔

"ظاہر ہے کہ قانون کا تعلق عالم خلق سے ہو گا، عالم امر سے نہیں۔ مثلاً یہ حقیقت ہے کہ کائنات میں نہ کوئی معلول بغیر علت کے وجود میں آسکتا ہے اور نہ کوئی شئے کسی پہلے سے موجود مسالہ کے بغیر وقوع پذیر ہو سکتی ہے یہ خدا کا قانون ہے لیکن اس کا تعلق عالم خلق سے ہے، عالم امر سے نہیں"

کتاب التقدیر، باب دوئم صفحہ 35۔ از جناب پرویزؒ

یعنی کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ ایک قانون کے تحت ہو رہا ہے، جسے "علت و معلول" کہا جاتا ہے اس قانون "علت و معلول" کی تعریف یہ کی جاتی ہے، کہ اگر ایسا کرو گے، تو ایسا ہو گا، اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ چنانچہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اس قانون "علت و معلول" کا ہی نتیجہ ہے۔ جسے خدا کبھی تبدیل نہیں کرتا۔

ایک ایسا نظریہ جو خلاف قرآن ہو، جس کی کوئی سند موجود نہیں۔ جو ایک انسانی ذہن کی پیداوار ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ ایسے نظریات و عقائد کے حوالے سے انسان تضادات کا شکار نہ ہو جائے۔ تحریر بالا میں جناب پرویز علیہ رحمہ جس قانون "علت و معلول" کے بغیر اس کارگہ حیات کا تصور تک کرنے سے انکاری ہیں۔

وہی جناب پرویزؒ ، ایک دوسری جگہ اس بات کا اقرار کرتے نظر آتے ہیں کہ۔۔ نہیں، کائنات میں ہر شیئے "علت و معلول" کی قیدی نہیں ہے بلکہ کچھ ایسے کارِ حیات ہیں، جہاں "علت و معلول" کا کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ جناب پرویزؒ ، لکھتے ہیں۔

"انسانی بچہ کی پیدائش آج ہمارے نزدیک ایک ایسا عادی اور معمولی واقعہ بن چکی ہے، جیسے سورج کا طلوع وغروب۔ لیکن اسباب و علل کی کڑیوں میں جکڑا ہوا انسان جب کتاب تخلیق کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹتا ہے تو اس کی نگہ استعجاب کا اس مقام پر جاکر رک جانا ضروری ہے جسے وہ سلسلہ تخلیق انسانی کی سب سے پہلی کڑی قرار دیتا ہے۔ اس وادی حیرت میں پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رہ جاتا ہے کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود میں آگیا۔ اس کا تحیر بجا، اور تعجب درست ہے۔ انسانی تحقیق و تفتیش کا ماحاصل اور اس کے تمام انکشافات وایجادات کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ کارگہ عالم کے مختلف پرزوں کے اسباب علل کی کڑیوں پر پڑے پردوں کو اپنی مژگان کاوش سے اٹھالیتا ہے۔ لیکن جہاں اس سلسلہ دراز کی آخری کڑی آجاتی ہے، اس کی نگہ تجسس کے سامنے پردہ حیرت کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔

مزید لکھتے ہیں۔۔

یہ ہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ایک خدا فراموش مادہ پرست اور ایک حق شناس عبد مومن کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اول الذکر اس مقام سے آگے وادی حیرت کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی آماجگاہ بناتا ہے اور اس طرح خود بھی ٹھوکریں کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی راہ سے گم کرتا ہے۔ لیکن ایک حکیم مومن وہاں پہنچ کر بلا تامل پکار اٹھتا ہے کہ اس سلسلہ دراز کی ابتداء اس قادر مطلق کی "اسباب فراموش مشیت اور علل نا آشنا صمدیت کی رہین منت ہے، جو طبعی سلاسل اسباب و ذرائع سے مستغنی اور علائق و علل

سے بے نیاز ہے "وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت عظمیٰ کا اعلان کرتا ہے اور اس طرح حیرت و استعجاب کی وہ وادی جو اس خدا فراموش محقق کی قیاس آرائیوں سے تیرہ و تار ہو چکی تھی اس مرد خود آگاہ و خدا مست کی مشعل ایمان و شمع ایقان سے جگمگا اٹھتی ہے"

ابلیس و آدم، باب اول انسان، صفحہ 02 از جناب پرویز علیہ رحمہ

غور فرمایا آپ نے۔ایک طرف یہ دعویٰ کہ کائنات میں کوئی شئے "علت و معلول" کے قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔دوسری طرف اس حقیقت کا اعلان کہ اس عالم خلق میں،انسانی زندگی کے اس سلسلہ دراز کی ابتداء اس قادر مطلق کی "اسباب فراموش مشیت اور علل ناآشنا صمدیت کی رہین منت ہے،جو طبعی سلاسل اسباب و ذرائع سے مستغنی اور علائق و علل سے بے نیاز ہے"

اس ہی بات کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا۔۔

" یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس دنیا کی ہر شئے علت و معلول کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے۔لیکن جب ہم اس سلسلے کو پیچھے کی طرف لے جائیں تو ایک مقام ضرور ایسا آئے گا جہاں یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔اور وہاں یہ تسلیم کرنا پڑے گا،کہ ایک معلول بغیر کسی سابقہ علت کے ظہور میں آگیا"

لغات القرآن صفحہ نمبر 989 از جناب پرویزؒ

اس ہی حوالے سے ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔۔

"خدا اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ یعنی اس نے اسے پہلے سے موجود مسالہ کے بغیر پیدا کیا۔ اس کا یہ فیصلہ کہ ایسی کائنات ظہور میں آنی چاہیے اور پھر اس کا یہ عمل جس سے اس نے اسے پیدا کیا، قانون علت و معلول اور دنیا میں نظام تخلیق و تولید کے یکسر خلاف ہے۔ ان امور کا تعلق عالم امر سے ہے۔ جس میں کوئی قانون نہیں بلکہ خدا کا ارادہ کارفرما ہوتا ہے۔ یہ ہی خدا کی وہ دنیا ہے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ " إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ [٢٢:١٤] - وہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق جیسا چاہے کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے " إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ [١١:١٠٧] یقیناً تیرا رب اپنے ارادے کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے" إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ [٥:١] وہ اپنی مرضی کے مطابق جس قسم کا چاہے فیصلہ کرتا ہے" إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ [٢٢:١٨]

کتاب التقدیر باب دوئم صفحہ نمبر 35 & 36

قرآن کریم کو درست طور پر سمجھنے میں جو شئے سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہے، اور آج بھی ہے وہ انسان کے اپنے مخصوص عقائد و نظریات ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ انسان اپنے عقائد کو قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھے، جو عقیدہ یا نظریہ قرآن کریم کی کسوٹی پر پورا اترتا ہو، وہ درست، اور جو قرآن کریم کی رو سے باطل ثابت ہو جائے وہ مسترد۔ لیکن بدقسمتی سے عموماً ایسا نہیں ہوتا۔

اپنے عقائد و نظریات کو قرآن کریم کے پیمانے پر پرکھنے کے بجائے، اپنے عقائد و نظریات کی دلیل اور سند قرآن سے ڈھونڈی جاتی ہے۔ اس عمل میں قرآن کریم کی سیدھی سادی آیات کا سیدھا سادہ ترجمہ کر کے

درست نتیجہ پر پہنچنے کے بجائے، قرآن کریم کی آیات کو فلسفیانہ رنگ دے کر، اس کی مختلف تاویلات کر کے، اور کسی آیت مبارکہ کا کوئی ایک حصہ اس کے سیاق وسباق سے الگ کر کے، اپنی مرضی ومنشاء کے مفاہیم تراش لیے جاتے ہیں۔ اور اس طرح قرآن کریم کو "مہجور" بنادیا جاتا ہے۔ جس کی دُھائی نبی روز جزاء اپنے رب کے آگے دے گا۔

جیسے ارشاد ہے۔۔

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا [۲۵:۳۰]

اور رسول کہے گا کہ "اے میرے رب، میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانہ تضحیک بنالیا تھا"
[ابوالاعلی مودودی]

آیئے دیکھتے ہیں، جن آیات مبارکہ کے ٹکرے، رب کریم کے غلبہ، اختیار، اقتدار، اور اپنی مرضی کے فیصلوں کے لیے جناب پرویزؒ نے بطور سند پیش کی ہیں، اور انہیں "عالم امر" سے مشروط کیا ہے، کیاواقعی یہ آیات مبارکہ خدا کے "عالم امر" سے متعلق ہیں؟؟

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ۖ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۗ وَمَن يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّكْرِمٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ [۲۲:۱۸]

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے لئے (وہ ساری مخلوق) سجدہ ریز ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج (بھی) اور چاند (بھی) اور ستارے (بھی) اور پہاڑ (بھی) اور درخت (بھی) اور جانور (بھی) اور بہت سے انسان (بھی)، اور بہت سے (انسان) ایسے بھی ہیں جن پر (ان کے کفر و شرک کے باعث) عذاب ثابت ہو چکا ہے، اور اللہ جسے ذلیل کر دے تو اسے کوئی عزت دینے والا نہیں ہے۔ بیشک اللہ جو چاہتا ہے کر دیتا ہے، [طاہر القادری]

ذرا غور فرمائیں، اس آیت مبارکہ کا آخری ٹکڑا کس طرح اپنے نظریہ کو درست ثابت کرنے کے لیے، غلط طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ذرا تفکر و تدبر فرمائیں۔ کیا اس آیت مبارکہ کا تعلق خدا کے "عالم امر" سے نظر آتا ہے؟

اس آیت مبارکہ سے پہلے کی آیات کا مطالعہ فرمائیں، کیا بات ہو رہی ہے۔ بات انسانوں کے کفر اور ایمان کی چلی آ رہی ہے۔ انسانوں کے مختلف عقائد کی ہو رہی ہے، اور ان کے اعمال کے نتائج کی ہو رہی ہے۔ مجھے بتایا جائے، کیا سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت، جانور، انسان۔۔۔ کیا یہ سب "عالم امر" سے تعلق رکھتے ہیں، یا اس ہماری مادی دنیا سے؟؟

آیئے دوسری آیت مبارکہ دیکھتے ہیں۔۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ ۚ أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۗ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ [۵:۱]

اے ایمان والو! (اپنے) عہد پورے کرو۔ تمہارے لئے چوپائے جانور (یعنی مویشی) حلال کر دیئے گئے (ہیں) سوائے ان (جانوروں) کے جن کا بیان تم پر آئندہ کیا جائے گا (لیکن) جب تم اِحرام کی حالت میں ہو، شکار کو حلال نہ سمجھنا۔

بیشک اللہ جو چاہتا ہے حکم فرماتا ہے، [طاہر القادری]

ذرا غور فرمائیں۔ انسانوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ کیا حلال ہے، کیا حرام ہے۔ لیکن ہمارے محترم بزرگ کو یہ آیت مبارکہ بھی اس مادی دنیا جسے وہ "عالم خلق" کہتے ہیں سے متعلق نظر نہیں آرہی۔ اس آیت مبارکہ میں بھی وہ رب اس "عالم خلق" میں اپنی مرضی و منشاء کے احکامات جاری کرنے کی قوت کا بیان فرمارہے ہیں۔ لیکن صرف اپنے مخصوص نظریہ و عقیدے کو درست ثابت کرنے کے لیے، آیت مبارکہ کے آخری ٹکڑے کو اپنا من مانا مفہوم دے کر، اسے "عالم امر" سے منسلک کرکے کس طرح بات کچھ سے کچھ بنادی گئی ہے۔

آیئے ایک اور آیت مبارکہ کو دیکھتے ہیں۔۔

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ [١١:١٠٦]

سو جو لوگ بدبخت ہوں گے (وہ) دوزخ میں (پڑے) ہوں گے ان کے مقدر میں وہاں چیخنا اور چلّانا ہو گا، [طاہر القادری]

خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ [١١:١٠٧]

وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین (جو اس وقت ہوں گے) قائم رہیں مگر یہ کہ جو آپ کا رب چاہے۔ بیشک آپ کا رب جو ارادہ فرماتا ہے کر گزرتا ہے، [طاہر القادری]

اس آیت مبارکہ پر بھی غور و خوض فرمالیں۔ کیا بات ہو رہی ہے۔ انسانوں کے اعمال کے نتائج کی بات ہو رہی ہے۔ آیت مبارکہ کے یہ الفاظ "جب تک آسمان اور زمین قائم رہیں" کس دنیا کی بات ہو رہی ہے؟

کیا یہ جنت اور جہنم اللہ کریم کی تخلیق نہیں ہیں۔ یہ ارض وسماء "عالم خلق "کا حصہ نہیں ہیں۔ کیا وہ خدا اس " عالم خلق "میں، اپنی مرضی ومنشاء کے فیصلوں کے نفاذ کا اعلان نہیں فرمارہے ہیں؟؟

بڑی ایمانداری کے ساتھ اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ کس طرح اپنے ذہن میں پہلے سے قائم ایک باطل عقیدہ کو ثابت کرنے کے لیے، قرآن کریم کی آیات کے ٹکڑے، سیاق وسباق سے علیحدہ کرکے، اپنا من مانا مفہوم دے کر قرآن کریم کی واضح اور حقیقی تعلیم کو اپنی مرضی اور منشاء کا رنگ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

وہ آیات مبارکہ جن کا تعلق ہماری اس دنیا اور اس میں جاری وساری احکامات خداوندی سے ہے، جو اس " عالم خلق "میں اس رب "عزیز وحکیم "کے غیر مشروط اختیار وارادے کی مظہر ہیں ، کس طرح انہیں " عالم امر "کے ساتھ جوڑ کر، اس "عالم خلق "میں اس رب ذوالجلال کو ایک مجبور ومہجور خدا کے روپ میں پیش کرنے کی دانستہ کوشش کی جاتی ہے۔

اب آیئے پرویز علیہ رحمہ کے نظریہ کے مطابق "عالم خلق" کے حوالے سے ان کے بیان پر غور کرتے ہیں۔

پرویز علیہ رحمہ لکھتے ہیں۔۔

"خدا نے اپنی مشیت کے مطابق کائنات کی تخلیق کر دی، اور اس منزل میں پہنچ کر اس نے اپنے پروگرام میں ایک عظیم تبدیلی پیدا کر دی۔ یہاں خدا نے اپنے امر کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کی چار دیواری میں محدود کر دیا۔ یہ مقام بڑے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ قرآن کریم میں قانون کا لفظ نہیں آیا، اس زمانے کے عربی لٹریچر میں بھی یہ لفظ ان معنی میں بہت کم نظر آتا ہے، اس کے بجائے قرآن کریم میں ایک اور مادہ استعمال ہوا ہے جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے، قانون سے بھی زیادہ ہمہ گیر ہے۔ وہ مادہ ہے (ق د ر) اس مادہ کا بنیادی معنی ہیں، اندازہ، پیمانہ۔۔۔۔"

آگے مزید لکھتے ہیں۔۔

"چونکہ کسی چیز کو ایک خاص اندازے اور پیمانے کے مطابق بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس شئے پر پوری پوری مقدرت حاصل ہو۔ اس لیے "قدرت علی شئ" کے معنی ہیں، مجھے اس قدر قوت حاصل تھی کہ میں اس چیز کو اپنے پیمانے کے مطابق بنا دیتا۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ "عالم امر" میں ہر فیصلہ یا ہر کام خدا کے اختیار مطلق اور ارادہ کامل کے ماتحت سر انجام پاتا ہے۔ وہاں کوئی لگا بندھا قانون نہیں جس کے مطابق ہر فیصلہ صادر ہو۔ لیکن "عالم خلق" میں خدا کا امر قائدے اور قانون کی چار دیواری میں محدود ہو جاتا ہے۔" وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا [۳۳:۳۸]" خدا کا امر پیمانوں کے قالب میں ڈھل گیا۔ وہ مقررہ اندازوں کا پابند ہو گیا۔ اور اس طرح" قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا [٦٥:٣] خدا نے ہر شئے کے لیے ایک پیمانہ مقرر کر دیا۔

ہر شئے کے لیے پیمانہ مقرر کا دیا، اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ پانی درجہ انجماد پر سیال سے ٹھوس ہو جاتا ہے۔ ایک خاص درجہ حرارت پر وہ پھر ٹھوس سے سیال ہو جاتا ہے۔ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ جس برتن میں ڈالو اس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ زیادہ حرارت پہنچائی جائے تو بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے، بخارات ہوا سے ہلکے ہوتے ہیں اس لیے وہ فضا میں بلند ہو جاتے ہیں۔ انہیں بادل کہا جاتا ہے ایک خاص درجے کی ٹھنڈک پہنچنے پر وہ بخارات پھر پانی میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور پانی چونکہ ہوا سے بھاری ہوتا ہے اس لیے بارش کی شکل میں زمین پر برس پڑتے ہیں۔ انہیں پانی کے پیمانے کہا جائے گا۔ یا یہ کہ ایک خاص مقدار تک پانی پیاس بجھاتا ہے اور ممد حیات ہے۔ لیکن اس ہی کی افراط انسان کی موت کا باعث بن جاتی ہے جیسے ڈوب کر مرنا۔ یہ بھی پانی کے پیمانے ہیں۔ یا مثلاً کھجور کا درخت برسوں کے بعد جا کر پھل دیتا ہے۔ اور کیلا چھ ماہ میں بار آور ہو جاتا ہے۔ یہ ان کے پیمانے ہیں۔ ببول کے بیج سے بے ثمر کانٹے دار درخت اگتا ہے اور آم کے بیج سے ثمر بہشت۔ انگبیں کے بھرے ہوئے گلاس۔

باادنیٰ تدبیر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ جس چیز کو قرآن نے "قدر" کہہ کر پکارا ہے، اسے ہماری اصطلاح میں قانون فطرت کہا جاتا ہے۔ لہٰذا، قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا [٦٥:٣] کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے اشیاء کائنات کے لیے قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ جن کے مطابق وہ وجود میں آتی ہیں، بڑھتی پھولتی، پھلتی اور اسکے بعد معدوم ہو جاتی یا کوئی اور ہیت اختیار کر لیتی ہیں"

کتاب التقدیر، باب دوئم۔۔ صفحہ نمبر 39۔ از جناب پرویزؒ

آیئے ایک بار پھر قرآن کریم سے پوچھتے ہیں کہ جن آیات مبارکہ کے ٹکڑوں کو جناب پرویزؒ نے خدائے برتر اور بالا، قادر مطلق کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کا "قیدی" ثابت کرنے کے لیے سند کے طور پر پیش کیا ہے، کیاواقعی ایسا ہی ہے؟ کیاواقعی وہ رب عزوجل، جس کے قبضہ قدرت میں کائنات کا ایک ایک ذرہ ہے، وہ اپنے بنائے ہوئے قوانین کے آگے بے بس ہو کر بیٹھ گیا ہے؟ معاذ اللہ خاموش تماشائی بن کے رہ گیاہے؟

وہ آیت مبارکہ، جس کے آخری حصہ کو، اپنے اس خود ساختہ، غیر قرآنی مفروضہ کو ثابت کرنے کے لیے اس کے سباق سے الگ کر کے پیش کیا گیا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَاهُ ۖ فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا [:]مَّا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ ۖ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا [۳۳:۳۸]

اے نبیؐ، یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ "اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر" اُس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا، تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو پھر جب زیدؓ اُس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ

رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے تھا۔۔ نبی پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہو یہی اللہ کی سنت ان سب انبیاء کے معاملہ میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے [ابوالا علی مودودی]

اس آیت مبارکہ کو بار بار پڑھیں، اس پر غور و فکر کریں، کیا کہہ رہی ہے یہ آیت مبارکہ ؟؟ اس آیت مبارکہ کا مضمون، اس کے سیاق و سباق میں زیر بحث مخصوص واقعہ، اور اس پر رب کریم کا نبی اکرم ﷺ کو ہدایات، اور اس آیت مبارکہ میں موجود آیت کا آخری ٹکڑا "وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا [۳۳:۳۸] کے متعلق پرویزؒ کا موقف، کیا دانستہ تحریف قرآن کے زمرے میں نہیں آتا؟

کیا اس آیت مبارکہ کا آخری حصہ واقعی، خدائے جبار و قہار، کو اپنے قوانین کا قیدی ثابت کر رہا ہے ؟؟

کس قدر جرات کی بات ہے کہ قرآن کریم کی ایک آیت کا آپریشن کرکے، اس کے ایک حصے کو، اسکے سیاق و سباق سے الگ کرکے، اپنے باطل عقیدہ کی سند کے طور پر پیش کیا جائے، اور اس پر اپنے باطل نظریہ کی عمارت تعمیر کر لی جائے۔۔

جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے، جب کسی عمارت کی بنیاد کی پہلی اینٹ ہی تیڑھی لگ جائے، تو ساری کی ساری عمارت ہی تیڑھی اٹھتی ہے۔ لیکن سچ کبھی چھپ ہی نہیں سکتا۔ جب انسان خلاف قرآن کوئی بات منوانے کی کوشش کرتا ہے، تو بے شمار تضادات کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ کچھ جناب پرویزؒ، کے ساتھ ہوا۔

چنانچہ اس ہی موضوع پر دوسری جگہ کچھ اس طرح فرماتے ہیں۔۔

" قرآن کریم کا یہ اہم اعلان کہ کائنات میں ہر شئے کے لیے پیمانے (قوانین، اندازے، تناسب، توازن) مقرر ہیں علمی دنیا میں ایک عظیم الشان حقیقت کا علمبر دار ہے۔ آج سائنس کی تحقیقات اور منکشافات، قدم قدم پر اس کی شہادت بہم پہنچا رہی ہے کہ کائنات میں قانون کی کار فرمائی ہے۔ یونہی اندھیر نگری نہیں۔ یعنی تمام کائنات (Rational Basis) پر چل رہی ہے۔ آپ (Rational) کے لفظ پر غور کیجئے۔ اس کے معنی ہیں جو (Ratio) کے مطابق ہو۔ اور (Ratio) قدر، پیمانے، اندازے، تناسب ہی کو کہتے ہیں۔۔ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا [۳۳:۳۸]۔۔ اللہ کا ہر معاملہ ایک خاص اندازے کے مطابق مقرر کردہ ہے۔ یہاں ہر بات (Rational) ہے، اندھی فطرت (Blind Nature) کار فرما نہیں ہے"

لغات القرآن، صفحہ نمبر 1337، 1338 از جناب پرویزؒ

غور فرمائیں ان الفاظ پر۔۔

" وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا [۳۳:۳۸]۔۔ اللہ کا ہر معاملہ ایک خاص اندازے کے مطابق مقرر کردہ ہے"

پہلے اس ہی آیت مبارکہ کا مفہوم یہ پیش کیا گیا تھا۔

" وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا [۳۳:۳۸]" خدا کا امر پیمانوں کے قالب میں ڈھل گیا۔ وہ مقررہ اندازوں کا پابند ہو گیا۔۔

ایک مفہوم اس خدائے بزرگ کو، اپنے بنائے ہوئے اندازوں کا قیدی ثابت کر رہا ہے۔ تو دوسرا مفہوم، کائنات میں جاری وساری، حکمت خداوندی کی کارفرمائی کو تسلیم کرتا ہے۔

اب اس دوسرے مفہوم کو آیت بالا میں فٹ کریں، کوئی کنفیوژن ہی نہیں رہتی۔ کہا جارہا ہے کہ لے پالک بیٹے حقیقی بیٹے نہیں ہوتے، چنانچہ انکی مطلقہ بیویاں، حقیقی بیٹوں کی بیویوں کی طرح، تم پر حرام نہیں ہیں۔ یہ ہمارا مقرر کیا ہوا ضابطہ ہے، جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔ اور جو ہم نے طے کر دیا ہے، وہ ہی ہو گا۔

اپنے اس نظریہ کی دلیل میں جو دوسری آیت مبارکہ کا ٹکڑا پیش کیا گیا ہے آیئے اس پر بھی تفکر و تدبر کر لیتے ہیں۔

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۚ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا [٦٥:٣]

اور اسے ایسی جگہ سے رِزق عطا فرماتا ہے جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے تو وہ (اللہ) اسے کافی ہے، بیشک اللہ اپنا کام پورا کر لینے والا ہے، بیشک اللہ نے ہر شے کے لئے اندازہ مقرر فرما رکھا ہے، [طاہر القادری]

وہ خدا اپنے بندوں کو کس طرح رزق عطا فرماتا ہے، اس کے لیے اس کی کیا حکمت عملی ہوا کرتی ہے، وہ اس رب کائنات کے سوا اور کون جان سکتا ہے؟ کیا انسان ان تمام حکمت عملیوں کو سمجھ چکا ہے جو اس کے رب کیطرف سے مقرر ہیں۔

آیت بالا میں لفظ "قدر" استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی اندازے، پیمانے کے بھی ہوتے ہیں، تو اس کے معنی "مقدار" کے بھی ہوتے ہیں۔ آگے جا کر میں ان قرآنی اصطلاحات پر، قرآنی دلائل کے ساتھ تفصیلاً بات کروں گا، اور بتاؤں گا کہ کس طرح، ایک خود ساختہ نظریہ کو درست ثابت کرنے کے لیے قرآن کریم کی بنیادی اصطلاحات کے معنی کو اپنی مرضی و منشاء کا مفہوم دیا گیا۔ کس طرح دانستہ طور پر، قرآن کریم کی حقیقی تعلیم کو، ایک دوسرا رخ دینے کی کوشش کی گئی۔

آیت بالا، اس امر کو واضح کرتی ہے کہ اللہ کریم اپنے مخلص بندوں کو، ان کے گمان سے بھی کہیں زیادہ رزق عطا فرماتے ہیں۔ جن کے اسباب کے حوالے سے انسان کو علم ہی نہیں ہوتا۔

آیئے ان چند مثالوں کو بھی عقل و فکر سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، جنہیں پرویز علیہ رحمہ نے قانون خداوندی کہا ہے، غیر متبدل کہا ہے۔ انہوں نے لکھا۔۔

"ہر شئے کے لیے پیمانہ مقرر کا دیا، اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ پانی درجہ انجماد پر سیال سے ٹھوس ہو جاتا ہے۔ ایک خاص درجہ حرارت پر وہ پھر ٹھوس سے سیال ہو جاتا ہے۔ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ جس برتن میں ڈالو اس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ زیادہ حرارت پہنچائی جائے تو بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے، بخارات ہوا سے ہلکے ہوتے ہیں اس لیے وہ فضا میں بلند ہو جاتے ہیں۔ انہیں بادل کہا جاتا ہے ایک خاص درجے کی ٹھنڈک پہنچنے پر وہ بخارات پھر پانی میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور پانی چونکہ ہوا سے بھاری ہوتا ہے اس لیے بارش کی شکل میں زمین پر برس پڑتے ہیں۔ انہیں پانی کے پیمانے کہا جائے

گا۔ یا یہ کہ ایک خاص مقدار تک پانی پیاس بجھاتا ہے اور ممد حیات ہے۔ لیکن اس ہی کی افراط انسان کی موت کا باعث بن جاتی ہے جیسے ڈوب کر مرنا۔ یہ بھی پانی کے پیمانے ہیں۔ یا مثلاً کھجور کا درخت برسوں کے بعد جا کر پھل دیتا ہے۔ اور کیلا چھ ماہ میں بارآور ہو جاتا ہے۔ یہ ان کے پیمانے ہیں۔ ببول کے بیج سے بے ثمر کانٹے دار درخت اگتا ہے اور آم کے بیج سے ثمر بہشت۔ انگبیں کے بھرے ہوئے گلاس۔

سب سے پہلے پانی کی مثال پر ہی بات کر لیتے ہیں۔ کہا کہ پانی سیال حالت میں نشیب کی طرف بہتا ہے۔ بلکل درست بات ہے، لیکن یہ ہی پانی اس رب کریم کے حکم سے، ہزار ہزار فٹ بلند درختوں کی سب سے بالائی ٹہنیوں تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ کیسے ؟؟

انسان ہزاروں فٹ بلندی تک، ایک پمپ کے ذریعے پانی پہنچا دیتا ہے۔ یقیناً انسان کا یہ عمل کسی نہ کسی قائدہ اور ضابطہ کے مطابق ہی انجام پذیر ہوتا ہے، تو کیا یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ، اللہ کریم کی مقرر کردہ ایک قدر، اس ہی کی دوسری قدر میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔

آج کے دور کا انسان بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ بارش کیسے ہوتی ہے۔ پانی کس درجہ حرارت پر بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور نقطہ انجماد پر، ٹھوس شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن کیا، صدیوں پہلے کا انسان یہ سب جانتا تھا؟؟

اس کا مشاہدہ تو صرف اتنا ہی تھا، کہ پانی ایک سیال شئے کا نام ہے، جو نشیب کی طرف بہتا ہے۔ اس کے دور میں، اس کے لیے تو یہ ہی ایک قانون تھا۔ اس کے لیے اس دور میں یہ بات قابل قبول ہو ہی نہیں سکتی

تھی کہ یہ ہی پانی، خود بخود، زمین سے کئی سو فٹ بلندی پر جا کر، بارش کی شکل میں برستا ہے۔ تو پھر یہ سوال اپنی جگہ پوری شدت کے ساتھ کھڑا ہے کہ کیا آج کا انسان بھی کسی شئے کے حوالے سے حتمی طور پر یہ بات کرنے کا متحمل ہو سکتا ہے کہ جی فلاں شئے کا یہ قانون ہے؟ اور یہ غیر متبدل ہے، ہمیشہ ایسا ہو تا رہا ہے اور ہمیشہ ایسا ہو تا رہے گا۔

حقیقت تو صرف اتنی ہے کہ ہر دور کا انسان، اپنے دور کی علمی ترقی کے مطابق، اپنے مشاہدات کو، قانون سمجھ لیتا ہے۔ اور اس بات کا دعوے دار کہ بس ایسا ہی ہے، اور ایسا ہی ہو گا۔

آج ہمارے دور میں کیلا، چار ماہ میں پھل دے دیتا ہے، اور لوگوں نے آم کے ساتھ کسی اور پھل کا پیوند لگا کر ایک تیسرا پھل پیدا کر لیا ہے۔ جو نہ آم ہو تا ہے اور نہ کچھ اور۔ چنانچہ اس مقام پر یہ "قانون" بھی مسترد قرار پاتا ہے کہ آم سے صرف آم ہی پیدا ہو تا ہے۔

حقیقت کیا ہے، قانون کیا ہے، اس پر میں آگے جا کر بات کروں گا۔

اس مقام پر صرف اتنا عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ کل تک کے انسان کا یہ ہی مشاہدہ تھا کہ آم سے صرف آم پیدا ہو تا ہے۔ کیلا چھ ماہ میں پھل دیتا ہے۔ اب تو ہم اس بات پر بھی قادر ہو گئے ہیں کہ سال کے بارہ مہینے، مختلف فصلیں حاصل کرتے رہیں، جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ اپنے موسم میں ہی پیدا ہوتی ہیں۔ خربوزہ اس کی بہترین مثال ہے۔

حقیقت صرف اتنی ہے کہ کل کے انسان کا مشاہدہ کچھ اور تھا، اور وہ اسے قانون کہتا تھا۔ آج کے دور کے انسان کا جو مشاہدہ ہے، وہ اسے قانون کہہ رہا ہے، جیسے جناب پرویزؒ نے کہا۔ جب کہ یہ قانون کے زمرے میں نہیں آتے۔۔ کیونکہ قانون کا پہلا اور آخری اصول، اس کی محکمیت، ہمہ گیری، اور غیر متبدل ہونا ہے جو وقت کے ہاتھوں تبدیل ہو جائے، وہ قانون نہیں ہوتا۔

اور بات صرف یہیں تک محدود نہیں رہ جاتی، جب کسی عمارت کی پہلی اینٹ ہی تیڑھی لگے، تو ساری کی ساری عمارت ہی کج اور فساد کی علامت بن جاتی ہے۔ مختلف قرآنی اصطلاحات، قدر، سنت اللہ، کلمۃ اللہ، وغیرہ کو دانستہ اپنی مرضی و منشاء کے معنی و مفہوم دے کر، ان کا جا بجا، بے دریغ استعمال کر کے، قرآن کریم کی حقیقی تعلیم کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی۔

قرآن احسن الحدیث

دوستو۔۔۔ قرآن کریم اللہ عزوجل کا کلام ہے۔ احسن الحدیث۔۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُدَى اللَّهِ يَهْدِي بِهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ

[۳۹:۲۳]

اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں اُسے سن کر اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں، اور پھر ان کے جسم

اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں یہ اللہ کی ہدایت ہے جس سے وہ راہ راست پر لے آتا ہے جسے چاہتا ہے اور جسے اللہ ہی ہدایت نہ دے اس کے لیے پھر کوئی ہادی نہیں ہے[ابوالاعلی مودودی]

وہ کتاب جسے اس کا مصنف "احسن الحدیث" کہتا ہے۔ عربی زبان میں "حسن" کے معنی توازن و تناسب کا قائم ہونا ہے۔ نہ ہی کچھ ضرورت سے زیادہ، اور نہ ہی کچھ ضرورت سے کم۔ توازن بدوش۔ قرآن کریم میں جو کچھ بیان ہوا ہے، اور جن جن الفاظ میں بیان ہوا ہے، وہ سارے کا سارا توازن بدوش ہے۔ نہ تو ایک لفظ بلاضرورت اور بے معنی استعمال ہوا ہے، اور نہ ہی اس میں کوئی ایک جملہ، کوئی ایک بات ایسی ہے تو بے مقصد بیان کی گئی ہے۔

یہ ہی وجہ ہے کہ اس رب کریم نے، اپنا ماضی الضمیر بیان کرنے کے لیے عربی جیسی فصیح و بلیغ زبان کا انتخاب کیا۔ قرآن کریم کا ہر لفظ اپنی اپنی جگہ ایک منفرد معنی و مفہوم کا حامل ہے۔ قرآن کریم کا کوئی لفظ کسی دوسرے لفظ کا مترادف نہیں ہے۔

تحریف قرآن

آپ صدیوں پر محیط تاریخ انسانی پر غور کریں، جب انسان کسی نظریہ کو عقیدہ بنالے، تو پھر اس کے لیے اس عقیدہ سے رجوع کرنا، ناممکن تو نہیں مگر بہت دشوار ضرور ہو جاتا ہے۔ ایسا کوئی دانستہ نہیں کرتا بلکہ اپنے تیئں وہ یہ ہی سمجھتا ہے کہ میں درست ہوں، اس ہی لیے اس پر اصرار کرتا ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہی آسمانی کتابوں کے نزول کا باعث ہے۔ تاکہ انسانوں کے درمیان ہونے والے اختلاف کا منصفانہ فیصلہ کیا جاسکے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا

[۴:۱۰۵]

اے نبیؐ! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تم بد دیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو [ابوالاعلی مودودی]

اب ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اس کتاب مبین کے مطابق ہم اپنے متنازعہ امور کے فیصلے کرتے۔ ان عقائد کو اس کی کسوٹی پر پرکھتے۔ جو اس کتاب اللہ کے مطابق ہوتا، اسے قبول کرتے، جو اس سے متصادم ہوتا، اسے رد کر دیتے۔

لیکن ہوا کیا؟؟

اس کا بیان میں نے اپنے نوٹ "ولقد یسرنا القرآن "میں بڑی وضاحت اور دلائل سے پیش کر دیا ہے۔ میں نے عرض کی تھی کہ ایک جانب اللہ کریم واضح الفاظ میں ارشاد فرماتا ہے۔۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ [۵۴:۱۷]

اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے؟
[فتح محمد جالندہری]

وہ ببانگ دہل اعلان کرتا ہے۔۔

تَنزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ [:] كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ [۴۱:۳]

یہ خدائے رحمان ورحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے۔۔ ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن، اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں [ابوالاعلی مودودی]

ایک ایسی کتاب جو آسان ہے، عام فہم ہے، ہر شئے کو واضح الفاظ میں بیان کر دینے والی ہے۔ اسکے ایک ایک لفظ کو " فلسفیانہ "رنگ دے کر، اپنی مرضی ومنشاء کا مفہوم دے کر، اپنے عقائد کو مستند کرنے کا سہو کیا گیا۔ اور بات کو کچھ سے کچھ بنادیا گیا۔۔

ذرااس حقیقت پر بھی غور فرمائیں، کہ دور نزول قرآن میں اللہ کی مخاطب اولین قوم کی تعلیمی پوزیشن کیا تھی۔ کیا آج کی طرح وہاں " تعلیمی "طبقات موجود تھے؟؟

آج ہمارے یہاں کوئی بیکن ہاوس سے پڑھا ہوا ہے، کوئی آکسفورڈ سے تعلیم یافتہ ہے، کوئی عام پرائیویٹ اسکول وکالج سے فارغ التحصیل ہے اور کوئی سرکاری اسکولوں سے پڑھا ہوا ہے۔ لیکن کیا دور نزول قران میں اس طرح کی کوئی تفاوت موجود تھی؟؟

تقریباً سب ہی ایک ماحول کے افراد تھے۔ یقیناً کچھ زیادہ ذہین ہوں گے، دوسروں کے مقابلے میں کچھ پڑھے لکھے ہوں گے، لیکن اکثیریت عمومی طور پر ذہنی صلاحیت اور علم کے اعتبار سے انیس بیس کے فرق

کے ساتھ ایک جیسی ہی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں کو سمجھانے کے لیے اللہ کریم نے کیا کیا۔ غور فرمائیں۔

فرمایا۔۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ ۖ أَأَعْجَمِيٌّ وَعَرَبِيٌّ ۗ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ ۖ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۚ أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ

[۴۱:۴۴]

اور اگر ہم اس (کتاب) کو عجمی زبان کا قرآن بنا دیتے تو یقیناً یہ کہتے کہ اِس کی آیتیں واضح طور پر بیان کیوں نہیں کی گئیں، کیا کتاب عجمی ہے اور رسول عربی ہے (اِس لئے اے محبوبِ مکرّم! ہم نے قرآن بھی آپ ہی کی زبان میں اتار دیا ہے۔) فرما دیجئے: وہ (قرآن) ایمان والوں کے لئے ہدایت (بھی) ہے اور شفا (بھی) ہے اور جو لوگ ایمان نہیں رکھتے اُن کے کانوں میں بہرے پن کا بوجھ ہے وہ اُن کے حق میں نابینا پن (بھی) ہے (گویا) وہ لوگ کسی دور کی جگہ سے پکارے جاتے ہیں، [طاہر القادری]

اس اعتراض کی جڑ ہی کاٹ دی گئی کہ جناب یہ قرآن بہت مشکل ہے، ہماری سمجھ سے بالا تر ہے، اس میں تو بڑی بڑی فلسفیانہ موشگافیاں کی گئی ہیں۔ اسے سمجھنے کے لیے ہمیں کسی علامہ کی ضرورت ہے، کسی فلاسفر کی ضرورت ہے، کسی مولانا کی ضرورت ہے۔۔

اب اس کا ایک پہلو اور بھی لے لیں۔۔ کیا خدا کے لیے یہ کچھ مشکل تھا کہ وہ یہ کتاب ایک بار مکمل طور پر نازل کر دیتا۔ پوری کی پوری۔۔ تو کیوں ایسا نہیں کیا؟؟

اس کا جواب بھی یہ کتاب دے رہی ہے ملاحظہ فرمائیں۔۔

وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنزِيلًا [۱۷:۱۰۶]

اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تا کہ تم ٹھیر ٹھیر کر اسے لوگوں کو سناؤ، اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اتارا ہے[ابوالاعلی مودودی]

اب ذرا غور فرمائیں۔ تھوڑا تھوڑا نازل کرنے کی علت کیا ہے۔ فرمایا۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۚ كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ ۖ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا

[:]وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا [۲۵:۳۳]

منکرین کہتے ہیں "اِس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟" ہاں، ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح ہم تمہارے ذہن نشین کرتے رہیں اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی ہے۔۔ اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے) کہ جب کبھی وہ تمہارے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے، اُس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمہیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی[ابوالاعلی مودودی]

ذرا غور فرمائیں۔۔ کیا کہا جا رہا ہے۔ کہا کہ اس کتاب اللہ کو ہم نے بتدریج نازل کیا۔ یکبارگی نازل نہیں کیا، تا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ آئے جس کے حوالے سے کوئی سوال اٹھے، تو تم اس کا جواب دے سکو۔ بتدریج نزول قران کا مقصد ہی قرآن کو بہتر طور پر سمجھانا تھا۔ اس وقت کے حالات، واقعات کے پس منظر میں جب آیات قرآنی نازل ہوتی تھیں، تو صحابہ کرام کو سمجھنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ تھا۔ کیونکہ ایک تو یہ

کتاب ان کی اپنی زبان میں تھی، آسان تھی، سلیس تھی، اور پھر جو واقعہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا، اس کے پس منظر میں بات بہت آسانی سے سمجھی جا سکتی تھی۔

یہ جو ہمارے یہاں شان نزول کا تصور ہے، یہ عین قرآنی ہے۔ قطع نظر اس بات کے، کہ ہماری کتب میں قرآن کریم کی آیات کے پس منظر میں جو شان نزول بیان کیے گئے ہیں، وہ کتنے مستند ہیں، کتنے درست ہیں۔۔ حرف بہ حرف درست ہیں بھی یا نہیں۔ لیکن یہ بات بہر حال قرآن کریم سے ثابت ہے کہ آیات قرآنی کا نزول اپنے وقت کے حالات واقعات کے تناظر میں بھی ہوتا تھا۔ اس مرحلے پر اس بات کی وضاحت لازم سمجھتا ہوں تا کہ ہم قرآن کریم کی ماہیت کو سمجھ لیں۔

قران کریم کا ایک حصہ اصل دین ہے۔ یہ دین اول نبیؑ سے لے کر آخری نبی ﷺ تک ایک ہی ہے۔ یقیناً یہ حصہ کسی بھی وقت کے مخصوص حالات، واقعات کے تناظر میں نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کے علاوہ دیگر معاملات کے حوالے سے اس دور کے واقعات کے تناظر میں قرآن کریم کا نزول ایک قرآنی حقیقت ہے۔ اس ضمن میں میرے ایک نوٹ " دین اور اس کا نفاذ " کا مطالعہ سود مند ہو سکتا ہے۔۔

اب ان حقائق کی روشنی میں، کیا یہ بات اہمیت کی حامل نہیں کہ قرآن کریم میں جو آیات نازل ہوئیں ہیں، ان میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ہم ان آیات کو اس کے سیاق وسباق کے ساتھ پڑھیں، سمجھیں کہ کوئی بھی بات کس تناظر میں کی جا رہی ہے؟؟

اگر اللہ کریم ایک جگہ اپنے کسی فعل کو تقدیر کہتے ہیں، کسی جگہ وعدہ کہتے ہیں، کسی جگہ سنت کہتے ہیں، کسی جگہ کلمہ کہتے ہیں، تو کیا یہ سارے الفاظ ہم معنی ہیں؟؟

ایک دوسرے کے مترادف ہیں؟؟

اور اگر ایسا ہے تو پھر کیا ضرورت تھی اللہ کریم کو مختلف الفاظ استعمال کرنے کی؟؟

ایک ہی لفظ اختیار کر لیتے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس بات کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ کسے اللہ اپنی سنت کہہ رہا ہے۔ کسے اپنی تقدیر کہہ رہا ہے۔ کسے اپنا وعدہ کہہ رہا ہے۔ اور پھر یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان آیات مبارکہ میں جہاں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا سیاق و سباق کیا ہے؟؟

ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ عموماً دوران گفتگو لوگ اپنا ماضی الضمیر بیان کرنے کے لئے جن الفاظ کا چناو کرتے ہیں، وہ درست نہیں ہوتا۔ بعض اوقات کچھ الفاظ کے معنی، ایک انسان کے ذہن میں کچھ ہوتے ہیں، تو دوسرے کے ذہن میں کچھ اور۔ اس وجہ سے بعض اوقات بہت مشکل صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ہی طرح، بعض اوقات کچھ الفاظ، اپنے حقیقی معنی و مفہوم کے بجائے، ایک بلکل منفرد معنی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ کریم نے بار بار اس بات کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے کہ یہ قرآن "عربی مبین" میں نازل کیا گیا ہے۔ اس بات کے تذکرہ کا واحد مطلب یہ ہی

ہے کہ جب بھی ہم قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش کریں، اس کے الفاظ کے معنی و مفہوم کا تعین، اس وقت کے لوگوں کی عربی کے مطابق کریں۔ یہ دیکھیں کہ کون سا لفظ دور نزول قرآن میں کن معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اللہ کریم نے فہم قرآن کا ایک اصول " تصریف آیات "بتایا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ کو بار بار مختلف آیات میں بیان کر کے اس کے درست معنی متعین کیے گئے ہیں۔ اگر کبھی کسی لفظ کے درست معنی کو سمجھنے میں کوئی مشکل درپیش ہو، تو چاہیے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں وہ لفظ استعمال ہوا ہے، ان ان جگہوں کے مضامین کے تناظر میں، اس لفظ کے درست معنی کا تعین کیا جائے۔

ہماری زبان کا ایک لفظ ہے " قانون "۔ ایک لفظ ہے "بات "۔۔ ایک لفظ ہے "اٹل "۔۔ احباب ان الفاظ کے چناو میں غلطی کرتے ہیں، عموماً لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا ہر لفظ، ہر بات قانون ہے، اٹل ہے۔ اپنی جگہ وہ درست ہی کہہ رہے ہوتے ہیں، لیکن یہ بات فنی طور پر درست نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کی ہر بات " قانون "نہیں ہے۔ لیکن اللہ کی ہر بات "اٹل "ضرور ہے۔

اٹل ہونا، اس بات کا اظہار ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اس میں کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ اگر کوئی وعدہ کیا جا رہا ہے تو پورا ہو گا، اگر کوئی واقعہ بیان ہو رہا ہے تو سچ ہے۔

یہ پورا قرآن کریم، اللہ کا کلام ہے۔ اللہ کی حدیث ہے۔۔ اللہ کی بات ہے۔ اب آپ غور فرمائیں۔ اس کتاب میں اقوام سابقہ کے حالات زندگی بیان ہوئے ہیں۔ بنی اسرائیل کیا کرتے تھے، فرعون نے کیا کہا،

فرعون کی بیوی نے کیا کہا، یوسف علیہ سلام کے بھائیوں نے کیا کیا، تخلیق آدم کے وقت ملائکہ نے کیا موقف اختیار کیا۔ ابلیس نے کیا عمل کیا۔ اصحاب کہف کے ساتھ کیا ہوا، مریم کو فرشتہ نے کیا کہا، پجاری کیا کر رہے تھے۔ کس نبی نے کیا دعا کی۔ ہمیں کیا دعا کرنی چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ اب یہ سب اللہ کریم کی باتیں ہیں، ہدایات ہیں، جو وہ ہمیں بتارہا ہے۔ کیا یہ سب " قانون "کے زمرے میں آتے ہیں؟

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا [۱۷:۸۸]

کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کو مددگار ہوں [فتح محمد جالندہری]

پھر ارشاد فرمایا۔۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ [۱۱:۱۳]

یہ کیا کہتے ہیں کہ اس نے قرآن از خود بنا لیا ہے؟ کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تم بھی ایسی دس سورتیں بنا لاؤ اور خدا کے سوا جس جس کو بلا سکتے ہو، بلا بھی لو [فتح محمد جالندہری

مزید ارشاد فرمایا۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ

[۱۰:۳۸]

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو اپنی طرف سے بنالیا ہے کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تم بھی اس طرح کی ایک سورت بنالاؤ اور خدا کے سوا جن کو تم بلا سکو بلا بھی لو [فتح محمد جالندہری]

غور فرمائیں۔ پہلے کہا گیا، کہ اس جیسا قرآن بنا کر دکھادو۔

پھر کہا، دس سورتیں بنالاؤ۔

پھر کہا، اس جیسی ایک سورۃ بنالاؤ۔

اب اس کو ہم کیا کہیں گے ؟

اب اگر اللہ کی ہر بات " قانون " کا مقام رکھتی ہے ، تو پھر غور فرمائیں ، ان تینوں میں سے کون سا چیلنج " قانون " ہے ؟

پورے قرآن والا، دس سورتوں والا، یا ایک سورۃ والا ؟

اور اگر یہ سب قانون کے دائرے میں آتے ہیں، تو کیوں اللہ کریم اس " قانون " کو بار بار تبدیل کر رہے ہیں ؟؟

حقیقت تو صرف اتنی ہے کہ اللہ کریم نے اس کتاب عظیم میں انسانوں کو مختلف طریقوں سے بات سمجھانے کی کوشش کی ہے، تاکہ اس کے بندے راہ ہدایت پالیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے کئی مقامات پر ایسا اسلوب اختیار کیا ہے، جیسا ہم انسان عام طور پر اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ انسان کو سمجھانے کے عمل میں، اللہ کریم کی ہر بات " قانون " کا درجہ نہیں رکھتی۔ اس فرق کو سمجھنا چاہیئے۔

اگر خدا کی ہر بات قانون کے زمرے میں آتی تو اللہ کو مخصوص مقامات پر، سنت اللہ، وعدہ اللہ، اور قدر کے الفاظ استعمال نہ کرنے پڑتے۔

آیئے سب سے پہلے دیکھتے ہیں کہ قانون کسے کہتے ہیں۔

پرویزؒ کہتے ہیں کہ، قانون کا لفظ قرآن کریم میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ دور نزول قرآن میں عربی معاشرے میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں مستعمل نہ تھا، جن معنوں میں ہم " قانون " کہتے ہیں۔۔

قانون کی عمومی تعریف یہ ہے کہ، یہ ہمیشہ غیر متبدل ہوتا ہے، کیونکہ " قانون " کا بنیادی فلسفہ ہی اس کی حاکمیت، اور ہمہ گیری ہوتا ہے اس میں اگر مگر چونکہ چنانچہ نہیں ہوتا۔ یہ سب پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔ چاہے حالات کچھ بھی ہوں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ جب کوئی قانون بنایا جاتا ہے، تو اس میں چند استثنیات پہلے سے ہی طے کر دی جاتی ہیں، تاکہ مخصوص حالات میں، اس قانون کا نفاذ کس طرح ہو کہ " قانون " کی حاکمیت قائم رہے۔ لیکن سنت، وعدے، بات، میں یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ سنت ایک مخصوص روش کا نام ہے جو کسی مخصوص صورتحال سے مشروط ہوتی ہے۔۔۔ وعدہ ایک مخصوص اور محدود عمل ہے۔۔ جب

کہ "قدر" اندازے اور پیمانے کو کہتے ہیں۔ بد قسمتی سے ان الفاظ کے من مانے معنی و مفہوم نے قرآن کریم کی تعلیمات کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔

آیئے اسے قرآن کریم سے سمجھتے ہیں۔

قدر

چونکہ پرویز علیہ رحمہ نے، اس لفظ "قدر" کو اُس معنی و مفہوم میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جسے ہمارے یہاں "قانون" کہا جاتا ہے، چنانچہ زیادہ مناسب ہو گا کہ میں یہاں اس لفظ "قدر" کے درست معنی و مفہوم کو جناب پرویزؒ، کی لغات القرآن ہی سے متعین کروں۔

1 ۔۔"قدر کے بنیادی معنی ہیں، اندازہ، پیمانہ۔ "قدرت الشئی" کے معنی ہیں، میں نے اس چیز کو ماپا، اس کا اندازہ کیا، اس کی لمبائی چوڑائی جسامت کمیت وغیرہ کا تعین کیا۔ بتایا کہ وہ کیسی ہے، کتنی ہے، اس کا تناسب کیا ہے

2۔۔ "قَدر" کے معنی ہیں، کسی شئے کا اندازہ، پیمانہ، حجم، جسامت، طول، عرض، وغیرہ۔۔۔

3۔۔ ان مثالوں سے واضح ہے کہ "قدر" اور "تقدیر" کے معنی ہیں، اندازہ اور پیمانہ۔۔ یا کسی چیز کو اندازہ اور پیمانہ کے مطابق بنا دینا۔ نیز کسی چیز کے تناسب اور توازن کو ٹھیک ٹھاک قائم رکھنا، متوازن اور معتدل رہنا۔۔

4۔۔ چونکہ کسی چیز کو کسی خاص اندازے یا پیمانے کے مطابق بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری پوری مقدرت حاصل ہو۔ اس لیے "قدر" کے معنی کسی چیز پر اقتدار اور اختیار رکھنے کے بھی ہیں۔ "قَدَرتُ علَی الشئی" کے معنی ہیں کہ مجھے اس قدر قوت حاصل تھی کہ میں اس چیز کو اپنی مرضی یا پیمانہ کے مطابق بنادیتا۔

اس بناء پر "قَدَرَ" کے معنی ہوتے ہیں، کسی چیز کو تیار وہموار کرنے یا کسی معاملے کو سرانجام دینے کے لیے اس پر غور وفکر کرنا۔ اس ہی سے اس کے معنی فیصلہ کرنے کے آتے ہیں۔

5۔۔ ایک چیز آپ بغیر ناپے تولے دے دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس میں کشادگی اور فراخی کا پہلو ہوتا ہے۔ لیکن دوسری چیز کو آپ ناپ تول کر دیتے ہیں، اس میں تنگی کا پہلو ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے "قدر" کے معنی تنگی کے بھی آتے ہیں۔ یعنی کسی کو ماپ کر دینا۔ نیز اس کے معنی تعظیم کے بھی ہوتے ہیں، یعنی جس مقام پر کوئی ہے، اس کا صحیح صحیح اندازہ رکھنا۔

"تقدیر" کے معنی ومفہوم کو مزید بیان کرتے ہوئے جناب پرویز علیہ رحمہ لکھتے ہیں۔۔

" گوشہ اول وہ ہے جہاں امر الٰہی کے مطابق ہر شئے وجود میں آتی ہے۔ اور اس کے قواعد و ضوابط (قوانین) اور خواص متعین ہوتے ہیں۔ یہ ہی قواعد وضوابط وخواص ان اشیاء کے پیمانے ہیں۔ ان ہی کو ان کی "تقدیریں" کہا جاتا ہے۔ آگ کی "تقدیر" یہ ہے کہ وہ حرارت پہنچاتی ہے۔ پانی کی "تقدیر" یہ ہے کہ وہ سیال ہے، نشیب کی طرف بہتا ہے، ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر بھاپ بن جاتا ہے، اور جب اسے

ٹھنڈ پہنچائی جائے تو پتھر کی طرح سخت ہو کر برف بن جاتا ہے۔۔ سورہ فرقان میں ہے "وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا [۲۵:۲] -- اللہ نے ہر شئے کو پیدا کیا۔ پھر ان کے لیے پیمانے اور اندازے مقرر کیے۔ امام راغب نے اس پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ اشیاء کے متعلق "تقدیر الٰہی" (پیمانوں) کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کسی شئے کو کامل طور پر یکبار گی بنا دے، اور اس میں کوئی کمی بیشی واقع نہ ہو۔ تاوقتیکہ خدا اسے فنا کرنا یا بدلنا نہ چاہے (جیسے سمٰوات)۔ اور دوسری یہ کہ کسی شئے میں کچھ بننے کی صلاحیتیں رکھ دی جائیں اور وہ رفتہ رفتہ اپنی انتہائی شکل تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اس کے سوا کچھ اور نہیں بن سکتی، جیسے بیج میں درخت بننے کی صلاحیت۔ یہ ہی اس کی "تقدیر" ہے۔

امام راغب نے جو پہلی بات کہی ہے (کہ بعض چیزوں کو جو کچھ بننا تھا، وہ بن چکی ہیں) سو وہ جس زمانے میں گزرے ہیں، اس میں یہ ہی کچھ کہہ سکتے تھے۔ ہمارے زمانے میں انکشافات جدیدہ کا رخ اس طرف ہے کہ جن چیزوں کے متعلق ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں کوئی تغیرات نہیں ہوتے، ان میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ تغیرات بڑے غیر محسوس اور غیر مرئی طریقہ سے واقع ہوتے ہیں۔ بہر حال اس بات سے قطع نظر "تقدیر" کے معنی ہیں کسی شئے کو ترقی دیتے ہوئے اس "قدر" (Pattern)، کے مطابق بنا دینا جو اس کے لیے متعین ہے۔ یعنی اس کی ممکنات (Potentialities)، کا مشہود (Actualize) ہو جانا، اور اس طرح اس کا اپنے آخری نقطہ تک پہنچ جانا۔۔

لغات القرآن، صفحہ نمبر 1335،1334۔۔ از جناب پرویز علیہ رحمہ

اس لفظ "قدر" کے حوالے سے مذکورہ بالا پوری تحریر کو ایک بار نہیں بار بار پڑھیں۔ اس پر تفکر و تدبر فرمائیں، اور پھر فیصلہ کریں کہ کیا، اس لفظ کے معنی "قانون" بنتے ہیں؟؟

قانون تو نام ہی اس شئے کا ہوتا ہے، جو حتمی ہو، اٹل ہو، غیر متبدل ہو۔ "قانون" میں اگر مگر نہیں ہوتے۔ نہ ہی "قانون" حالات کے زیر اثر ہوا کرتا ہے۔ بلکہ یہ تو ہر حال میں نافذ العمل ہوتا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ "قانون" بنانے والے، ہمیشہ "قانون" بناتے وقت، تمام ممکنہ حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے، اس کی استثنیات پہلے ہی طے کر دیتے ہیں۔

اللہ کریم کا ایک "قانون"، اجتماع صلوٰۃ سے پہلے وضو کرنے کا ہے۔ یہ ہر حال میں نافذ ہے۔ کوئی اگر مگر نہیں۔ اس بات کے امکان کے پیش نظر کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ پانی دستیاب نہ ہو۔ یا کسی بیماری کی وجہ سے، پانی کا استعمال انسان کے لیے مضر ہو۔ چنانچہ پہلے ہی استثنیٰ طے کر دی گئی کہ اگر ایسی کوئی صورتحال ہو تو "تیمم" کر لیا جائے۔

اللہ کا ایک "قانون" روزے رکھنا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ہر صورتحال کے مطابق، استثنیات پہلے ہی طے کر دی گئی ہیں۔ اب کوئی اگر مگر نہیں۔ اللہ کا ایک "قانون" یہ ہے کہ ماں سے نکاح جائز نہیں۔ اب یہ طے شدہ ہے، غیر متبدل ہے۔ حالات خواہ کچھ بھی ہوں، یہ کبھی بھی نہ ہو گا کہ ماں کے ساتھ نکاح جائز ہو جائے۔

چنانچہ قرآن کریم کی ایک منفرد اصطلاح "قدر"، کا معنی "قانون" کر کے، اسے غیر متبدل قرار دے دینا

بہت بڑا سہو ہے۔ غلط نگہی ہے۔ آپ پورے قرآن کریم کا مطالعہ کر لیں، کیا ایک بھی جگہ اس رب کریم نے اس کائنات کے مقرر کردہ "اندازے، پیمانے" کو قانون کہا ہے؟ انہیں غیر متبدل کہا ہے؟؟

حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ کریم نے اس کائنات کو تخلیق کیا، اس میں موجود ہر شئے کا ایک اندازہ، پیمانہ مقرر فرمایا۔ کیا ہوتا ہے یہ اندازہ۔۔ کیا ہوتا ہے یہ پیمانہ۔۔ ایک بار پھر جناب پرویز علیہ رحمہ ہی کے الفاظ میں دوہرا دیتا ہوں۔۔

" ۔ ہمارے زمانے میں انکشافات جدیدہ کا رخ اس طرف ہے کہ جن چیزوں کے متعلق ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں کوئی تغیرات نہیں ہوتے، ان میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ تغیرات بڑے غیر محسوس اور غیر مرئی طریقہ سے واقع ہوتے ہیں۔ بہر حال اس بات سے قطع نظر "تقدیر" کے معنی ہیں کسی شئے کو ترقی دیتے ہوئے اس "قدر"(Pattern)، کے مطابق بنا دینا جو اس کے لیے متعین ہے۔ یعنی اس کی ممکنات (Potentialities)، کا مشہود (Actualize) ہو جانا، اور اس طرح اس کا اپنے آخری نقطہ تک پہنچ جانا۔۔

لغات القرآن، صفحہ نمبر 1335، 1334۔۔ از جناب پرویز علیہ رحمہ

یعنی کسی شئے کا اپنی ابتداء سے اپنی انتہا تک پہنچنے کا عمل اس شئے کی "تقدیر" کہلاتی ہے۔ کائنات کی ہر شئے تغیر پذیر ہے۔ غیر محسوس انداز میں، یہ عمل صدیوں سے جاری و ساری ہے، اور جاری و ساری رہے گا۔

ہر دور کا انسان، اپنے مشاہدات کی بناء پر کسی بھی شئے کے متعلق یہ گمان کرتا ہے کہ یہ ہی اس شئے کی انتہا

ہے۔ اس شئے کا " قانون " ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اسے ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔

آج ہمارے دور میں سائنس کی ترقی ہمیں بتاتی ہے کہ پانی ایک سیال مادہ ہے۔ جو نشیب کی طرف بہتا ہے۔ ایک مخصوص درجہ حرارت پر بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نقطہ انجماد پر، ٹھوس شکل اختیار کر لیتا ہے آج کی سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ جب سورج کی تپش سمندر، دریا وغیرہ کے پانی پر پڑتی ہے، تو حرارت سے پانی بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ چونکہ بخارات، ہوا سے ہلکے ہوتے ہیں، اس لیے وہ اوپر کی طرف اٹھتے ہیں۔ ایک مخصوص بلندی تک پہنچ کر، جہاں درجہ حرارت کم ہوتا ہے، یہ بخارات ایک بار پھر پانی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ چونکہ پانی ہوا سے بھاری ہوتا ہے، اس لیے وہ بارش کی شکل میں دوبارہ زمین پر برسنا شروع کر دیتا ہے۔

اب آپ چند صدیوں پہلے کے انسان کا تصور کریں۔ اس دور کی علمی ترقی کا اندازہ کریں۔ صدیوں پہلے کے انسان کا کیا مشاہدہ تھا۔ یہ ہی نہ کہ پانی ایک سیال شئے ہے اور ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ہی پانی، بخارات کی شکل میں اوپر جا کر، ہم پر بارش کی شکل میں برستا ہے۔ اس کے لیے یہ بات قابل قبول ہی نہ تھی کہ پانی اوپر بھی اٹھ سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے تو پانی کا قانون صرف یہ ہی تھا کہ وہ سیال ہے اور نشیب کی طرف بہتا ہے۔ کیونکہ یہ ہی اسکا مشاہدہ تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ، جس طرح صدیوں پہلے کا انسان، پانی کے بخارات میں تبدیل ہونے کی "قدر" سے نا آشنا تھا، اور اپنے دور کے مشاہدے ہی کو "اللہ کا قانون" سمجھتا تھا۔ اس کو غیر متبدل مانتا تھا، آج کے دور کی علمی ترقی نے اس کے اس گمان کو غلط ثابت کر دیا۔

کیا آج کا انسان یا ہمارے بعد آنے والے دور کا انسان اپنے دور کے علمی حقائق کی بناء پر اس بات کا حتمی طور پر دعویٰ کر سکتا ہے کہ جو اس کا مشاہدہ ہے، وہ ہی قانون خداوندی ہے ؟؟

اٹل ہے ؟؟

غیر متبدل ہے ؟؟

صدیوں پہلے کا انسان روزانہ سورج کے طلوع، وغروب کا مشاہدہ کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سورج، روشنی دیتا ہے، حرارت پہنچاتا ہے۔ اس کے لیے یہ ہی سورج کے متعلق "اللہ کا قانون" تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اللہ کریم نے اس ہی سورج کا ایک اور اندازہ بھی مقرر کیا ہوا ہے۔ جس کی بدولت یہ بے پناہ توانائی کا منبع ہے۔ اس میں ایٹم کی وہ طاقت و قوت موجود ہے، جس سے یہ ساری کائنات متعدد بار تباہ کی جا سکتی ہے۔ اس سے بجلی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس سے گاڑیاں چلائی جا سکتی ہیں۔

آج کے دور کے انسان نے اس سورج کی مزید "قدریں" دریافت کیں۔ ان سے استفادہ کیا۔ لیکن کیا یہ انسان بھی اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے سورج کے متعلق، اللہ کریم کے مقرر کیے ہوئے سارے " اندازے و پیمانے " دریافت کر لیے ہیں ؟؟

کیا وہ ان " اندازوں اور پیمانوں " کو جو آج کے دور میں مشہود ہوئے ہیں، حرف آخر کہہ سکتا ہے ؟؟

تبدل وتحول

آیئے اب اس بات پر غور کرتے ہیں کہ دور حاضر تک کی ساری علمی وسائنسی ترقی نے اشیاء کائنات کے متعلق جن "اندازوں اور پیمانوں" کو دریافت کیا ہے، کیاان میں تحول و تبدل واقع نہیں ہوتا؟؟؟

اس رب کریم نے اپنی مرضی و منشاء سے، اپنی حکمت بالغہ سے، اپنے غلبہ و اقتدار، قوت اور اختیار کے بل بوتے پر اس کائنات کو تخلیق کیا۔ اس کائنات کے ہر ذرے کو تراشا۔ اس میں اپنی مرضی کے رنگ بھرے۔ پھر اس نے اپنی مرضی سے انسان کو تخلیق کیا۔ اسے ان اشیاء کا علم عطا فرمایا۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا [٢:٣١] -- اسے وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ [٩٦:٥] پھر ان کائناتی قوتوں کو حکم دیا کہ وہ انسان کے آگے سجدہ ریز ہو جائیں۔ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ [٢:٣٤] اور ایک معینہ عرصہ تک اس میں قیام کرنے کا حکم دیا۔ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ [٢:٣٦]

اس کے بعد اس ساری کائنات کو اس انسان کے لیے مسخر فرمادیا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ [٤٥:١٣]

اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا، سب کچھ اپنے پاس سے اِس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں [ابوالاعلی مودودی]

اس خالق کائنات نے ساری کائنات کی ابتداء سے اس کی انتہا تک کے سارے مراحل کے اندازے مقرر کیے۔ آیئے اس بات پر غور کرتے ہیں کہ کیا یہ انسان، اشیاء کائنات کے متعلق اللہ کریم کے طے کئے ہوئے "اندازوں اور پیمانوں" کے سامنے مجبور محض ہے، یا اس خدا عزو جل نے اپنی اس مخلوق کو، اس بات کا اختیار بھی عطا کیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے، اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق، ان اشیاء کائنات کے مقرر کردہ "اندازوں اور پیمانوں" میں حسب منشاء تغیر و تبدل کرکے، اپنا مقصد حاصل کرلے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، اس رب کریم نے پانی کا ایک اندازہ مقرر کیا کہ یہ سیال حالت میں نشیب کی طرف بہے گا۔ اللہ کریم کی مقرر کردہ اس "قدر" کو، جسے جناب پرویز علیہ رحمہ خدا کا قانون کہتے ہیں، انسان کے ہاتھ کی ایک انگلی جب چاہے لمحوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ انسان ایک پمپ کے ذریعے، اس نشیب میں بہنے والے پانی کی اس "قدر" کو اپنی مرضی سے بلندی کی طرف بہا کر، تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا معمول ہے۔

پہاڑی علاقوں میں موجود ہزاروں فٹ بلند درخت میں پانی کی نشیب میں بہنے والی یہ "قدر" مستقل طور پر تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ جب ہزاروں فٹ گہرائی سے یہ پانی، اس درخت کی سب سے بلند ٹہنی تک، نشیب سے اوج کی طرف بہتا ہے۔

اس ہی سیال پانی کو انسان ایک ریفریجریٹر کے ذریعے، چند منٹوں میں جب چاہے ٹھوس شکل دے دیتا ہے یا کسی بوائلر میں ڈال کر، بھاپ میں تبدیل کر دیتا ہے۔

آگ کی ایک "قدر"، جلانا بھی ہے۔ لیکن یہ انسان آج اس بات پر بھی قادر ہے کہ یہ آگ اسے نہ جلا سکے۔ آج انسان نے ایسے لباس، خیمے اور دیگر اشیاء بنالی ہیں، جن پر آگ کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

سنکھیا کی "قدر" جان لینا ہے۔ لیکن آج انسان اس بات پر قادر ہے کہ سنکھیا انسانی جان نہ لے سکے۔ انواع اقسام کی فصلیں، پھل جن کی پیداوار مہینوں اور سالوں میں ہوتی تھی، آج وہ ہفتوں اور مہینوں میں ممکن ہیں۔ چیچک کا جراثیم، جس کی "قدر" موت تھی، انسان کی بد نمائی تھی۔ آج انسان نے اللہ کریم کی اس "قدر" کو صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیا ہے۔ ناپید کر دیا ہے۔

لاکھوں سال سے انسان کا ایک مشاہدہ تھا کہ لوہے کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی سوئی پانی میں ڈوب جاتی ہے لیکن لکڑی کا بڑے سے بڑا ٹکڑا، تیر تا رہتا ہے۔ ان انسانوں کا صدیوں کا یہ مشاہدہ ان کے لیے "قانون" ہی تھا کہ لکڑی پانی پر تیرتی ہے، جبکہ لوہا، ڈوب جاتا ہے۔ اس ہی وجہ سے انسان لکڑی کی کشتیاں بناتا تھا۔ لیکن آج کیا ہو رہا ہے ؟؟

ہزاروں ٹن وزنی لوہے کا جہاز، پانی کی لہروں پر سبک رفتار سے رواں دواں ہوتا ہے۔ لاکھوں میل کی مسافت طے کرتا ہے۔

ہزاروں فٹ بلندی پر ہواؤں میں محو پرواز ہے۔

ذرا غور فرمائیں۔ آج سے ایک دو صدی پہلے کے اس انسان کے بارے میں۔ اگر اس وقت کوئی اسے کہتا کہ نہیں جناب ہزاروں ٹن لوہا بھی پانی پر تیر سکتا ہے۔ ہواؤں میں اڑ سکتا ہے۔ کیا کرتا وہ انسان۔

مرنے مارنے پر آجاتا۔ کتنے ہی مباحثے کرتا ہو گا وہ۔ کون کون سے دلائل نہ دیتا ہو گا۔

کیا لوہے میں یہ صلاحیت، آج سے چند صدی پہلے نہ تھی؟؟

یقیناً تھی، لیکن انسان اس سے واقف نہ تھا۔ آج اگر یہ ٹنوں وزنی لوہے کے جہاز، سطحِ سمندر پر تیرتے رہتے ہیں، یا ہزاروں فٹ بلندی پر پرواز کرتے ہیں، تو کیا یہ اللہ کریم کے مقرر کردہ کسی "اندازے یا پیمانے "یا پرویزؒ کے الفاظ میں "قانون" سے بالاتر ہے؟؟

کیا چند صدی پہلے کے انسانی مشاہدے کے خلاف لوہے کے جہاز کی یہ "قدر" قانون خداوندی میں تبدیلی کہلائے گی؟؟

بات تو اتنی سی ہے کہ اللہ کریم نے لوہے کے جو "اندازے اور پیمانے" مقرر کیے، چند صدی پہلے کے انسانوں کو ان کا علم نہ تھا۔ ان کے نزدیک لوہا پانی میں ڈوب جاتا ہے، قانون خداوندی تھا۔ آج ہمارا مشاہدہ ہمیں بتا رہا ہے کہ لوہا پانی پر تیرتا ہے، ہوا میں اڑتا ہے۔ ہم اسے قانون خداوندی سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم نہیں جانتے کہ رب کریم نے اس لوہے کی مزید کون کون سی "قدریں" مقرر کی ہوئی ہیں۔ آنے والے دنوں میں، یہ ہی لوہا، مزید کون کون سی خدمات سرانجام دے گا۔ چنانچہ اپنی دور کے مشاہدات کو قانون خداوندی کہنا، انہیں غیر متبدل کہنا، درست عمل نہیں ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اللہ کریم نے اس زمین میں ایک طاقت رکھی ہے جسے ہم کشش ثقل کہتے ہیں۔ یہ اس کشش ثقل کا ہی کرشمہ ہے کہ ہر شئے زمین پر آکر گرتی ہے۔ یہ زمین کی مقرر کردہ بہت ساری

"قدروں" میں سے ایک "قدر" ہے۔ لیکن آج انسان نے راکٹ ایجاد کر لیے ہیں۔ جو اس کشش ثقل کو توڑ کر اس زمین کے مدار سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اس طرح اللہ کے مقرر کردہ "اندازے اور پیمانے "کو اس کے مقرر کردہ دوسرے "اندازے اور پیمانے" سے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن طوالت کا خوف، مانع ہے۔ چنانچہ یہ کہنا کہ اللہ کریم کے مقرر کردہ "قدریں" قانون " ہوتی ہیں۔ غیر متبدل ہوتی ہیں۔ ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ فہم کا سہو ہے۔ بصیرت کی گمراہی ہے۔ عقل کا فقدان ہے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ

اب سوال یہ ہے کہ وہ رب، خالق و مالک، جس نے اس ساری گارگہ حیات کو تخلیق کیا۔ اس میں موجود ہر شئ کی "تقدیر "کا فیصلہ کیا۔ کیا وہ اپنے مقرر کردہ ان "اندازوں اور پیمانوں" کے آگے بے بس ہے۔ کیا وہ اپنی مرضی و منشاء سے ان "قدروں "کو تبدیل کرنے پر دسترس نہیں رکھتا۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے اوپر پیش کردہ "لغات القرآن" کے چوتھے نکتہ پر دوبارہ نظر دوڑائیں۔ کہا۔

"چونکہ کسی چیز کو کسی خاص اندازے یا پیمانے کے مطابق بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری پوری مقدرت حاصل ہو۔ اس لیے "قدر" کے معنی کسی چیز پر اقتدار اور اختیار رکھنے کے بھی ہیں۔ "قَدَرتُ عَلَى الشئی" کے معنی ہیں کہ مجھے اس قدر قوت حاصل تھی کہ میں اس چیز کو اپنی مرضی یا پیمانہ کے مطابق بنا دیتا"

چنانچہ وہ خدا، جسے اتنی قوت، طاقت، اقتدار اور غلبہ حاصل ہے، کیا وہ اپنے ہی مقرر کردہ ان "قدروں" کے سامنے مجبور و مہجور بن کے رہ گیا ہے؟

کیا واقعی وہ خدا ان "اندازوں اور پیمانوں" کے مقرر کرنے کے بعد ایک خاموش تماشائی بن گیا ہے؟

وہ خدا جو قرآن کریم میں جگہ جگہ "إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" کے الفاظ میں اپنے غلبہ، اقتدار، اختیار، قوت، طاقت، گرفت، کا اعلان فرما رہا ہے، کیا وہ اپنے بنائے ہوئے ان "اندازوں اور پیمانوں" میں تغیر و تبدل کی صلاحیت سے محروم ہے؟

کیا اس نے کبھی ان "اندازوں اور پیمانوں" میں تغیر و تبدل نہیں کیا؟

آیئے پہلے اس ضمن میں جناب پرویز علیہ رحمہ کے نقطہ نظر پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ جناب پرویز علیہ رحمہ فرماتے ہیں۔

" آپ نے غور فرمایا، اس دلیل میں خدا نے کتنی عظیم حقیقت بیان کر دی ہے۔ یعنی یہ درست ہے کہ وہ "بدیع السموات والارض" ہے ،وہ بغیر کسی سابقہ مسالہ کے اور بلا پابندی قانون علت و معلول، کائنات کو عدم سے وجود میں لے آیا ہے، لیکن اس کے لیے یہ کیا مشکل ہے کہ وہ اپنے ہاں ایک بیٹا بھی اس طرح پیدا کر لے۔ لیکن جب اس نے بچے کی پیدائش کے لیے ایک قانون بنا دیا ہے، تو اس قانون کی خلاف ورزی وہ خود بھی نہیں کرتا۔ وہ ایسا کر سکتا ہے، لیکن ایسا کرتا نہیں ہے۔ اور اس میں کہ وہ ایسا کر سکتا ہے لیکن کرتا نہیں ہے ایک بڑا نکتہ پوشیدہ ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر خدا کو بھی قوانین کا پابند تسلیم کر لیا جائے

تو وہ قادر مطلق نہیں رہتا۔ مجبور ہو جاتا ہے اور یہ خدا کی شان کے خلاف ہے۔ لیکن ایسا سمجھنا سطح بینی، اور غلط نگہی کا نتیجہ ہے۔ مجبور وہ ہوتا ہے جو کسی دوسرے کی طرف سے عائد کردہ پابندی کا پابند ہو۔ لیکن جو خود اپنے اختیار و ارادے سے اپنے اوپر کوئی پابندی عائد کر لے، اسے مجبور نہیں کہا جاتا۔ اگر آپ کو حکماً کہا جائے، کہ آپ ہر روز صبح کے وقت تین میل کا چکر لگائیں، تو آپ اس حکم کی تعمیل جبراً کریں گے۔ لیکن اگر آپ خود یہ فیصلہ کریں کہ آپ ہر روز صبح کے وقت تین میل کی سیر کیا کریں گے، اور پھر آپ التزاماً سیر کریں، تو اسے آپ پر جبر نہیں کہا جائے گا۔ اپنے وعدوں کا ہمیشہ ایفا کرنے والا، اپنے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے والا، بات کا پکا، قول و اقرار کا پورا، مرد مجبور نہیں کہلاتا۔ اصول پرست، قابل اعتماد کہلاتا ہے۔ اس لیے خدا نے اگر اپنی قدرت کاملہ، اور اختیار مطلق کے باوجود اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر لی ہیں تو اس سے اس کے قادر مطلق ہونے میں نقص واقع نہیں ہوتا۔ یہ تو بلکہ صاحب عزم صمیم ہونے کی دلیل ہے۔ کہ وہ سب کچھ کر سکنے کے اختیارات و قدرت رکھنے کے باوجود، اپنے اصول کو نہیں توڑتا، اپنے وعدے سے نہیں پھرتا، اپنے وضع کردہ قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اور سچ پوچھیے تو خدا ہونا زیبا ہی اسے دیتا ہے، جو اس قدر لا محدود اختیارات اور لا انتہا قوتوں کا مالک ہونے کے باوجود اتنی شدت سے بات کا پکا اور وعدے کا سچا (اصولوں کا پابند) رہے۔ یہ ہی وہ خدا ہے جس پر اعتماد کلی کیا جا سکتا ہے۔ یاد رکھیے، خدا ایسا کر سکتا تھا کہ کائنات کو پیدا کر دیتا، لیکن اس کے لیے کوئی قائدہ یا قانون مقرر نہ کرتا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا کیا نہیں۔ اس نے اس کے لیے قوانین مقرر کر دیئے۔ وہ پھر ایسا بھی کر سکتا تھا، کہ اپنے مقرر کردہ قوانین کو جب جی چاہے بدل دے، لیکن اس نے کہا کہ ہم، ایسا

کر سکنے کے باوجود ایسا کریں گے نہیں"

کتاب التقدیر، صفحہ نمبر 49۔۔48 از جناب پرویز علیہ رحمہ

مذکورہ بالا اقتباس میں جناب پرویز علیہ رحمہ نے بتکرار " قانون " کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور پھر اس مالک کائنات کو ان قوانین کا پابند ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

آیئے اس لفظ " قانون " کے متعلق جناب پرویز علیہ رحمہ کے اپنے الفاظ کو ایک بار پھر جائزہ لیتے ہیں۔

" قرآن کریم میں " قانون " کا لفظ نہیں آیا، اس زمانے کے عربی لٹریچر میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں بہت کم نظر آتا ہے "۔۔

کتاب التقدیر صفحہ نمبر 38

قرآنی اصطلاحات کے حوالے سے ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ مسائل حیات کے متعلق بہت سی الجھنوں، پیچیدگیوں، اور کشمکشوں کی وجہ الفاظ کا غلط استعمال، یا ان کا غلط مفہوم ہے۔ اور قرآن کریم کے سمجھنے کا صحیح طریق یہ ہی ہے کہ اس کے الفاظ، اصطلاحات، یا تصورات (Concepts)، کا صحیح مفہوم متعین کیا جائے "

کتاب التقدیر، صفحہ نمبر 42۔۔ از جناب پرویز علیہ رحمہ

اس لفظ " قانون " کی تعریف بیان کرتے ہوئے جناب پرویز علیہ رحمہ لکھتے ہیں۔

" قانون " (Law)، کی تعریف (Definition)، یہ ہے کہ۔

If .... Then .... Always

"اگر ایسا کروگے، تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا، اور ایسا ہمیشہ ہو گا۔ یہ آخری شرط " قانون " کی اساس و بنیاد ہے۔ حکم کے معنی فیصلہ کے ہیں۔ جب کوئی حکم (فیصلہ) ایسی شکل اختیار کرلے کہ اس میں تبدیلی کا امکان نہ رہے، تو اسے " قانون " کہا جائے گا۔ بالفاظ دیگر " قانون " غیر متبدل فیصلے کو کہا جائے گا۔ خدا نے اشیاء کائنات کے جو فیصلے کئے ہیں، یعنی ان کے " پیمانے " مقرر کئے ہیں، وہ غیر متبدل ہیں "

کتاب التقدیر، صفحہ نمبر 42۔۔ از جناب پرویز علیہ رحمہ

قرآن کریم میں، اللہ رب عزوجل نے، اس کتاب کے من جانب اللہ ہونے کی جو دلیل پیش کی ہے وہ اس کتاب عظیم میں کسی تضاد کی عدم موجودگی ہے۔ اللہ کا کلام، ان تضادات سے پاک ہوتا ہے، جو انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اپنے محدود علم و بصیرت، اور پہلے سے قائم شدہ اپنے مخصوص عقائد و نظریات کی بناء پر انسان عموماً تضاد بیانی کا مرتکب ہوجاتا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں اقتباسات پر غور فرمائیں۔ پہلے کہا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

" قرآن کریم میں " قانون " کا لفظ نہیں آیا، اس زمانے کے عربی لٹریچر میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں بہت کم نظر آتا ہے "

پھر کہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

" حقیقت یہ ہے کہ مسائل حیات کے متعلق بہت سی الجھنوں، پیچیدگیوں، اور کشمکشوں کی وجہ الفاظ کا غلط استعمال، یا ان کا غلط مفہوم ہے۔ اور قرآن کریم کے سمجھنے کا صحیح طریق یہ ہی ہے کہ اس کے الفاظ، اصطلاحات، یا تصورات (Concepts)، کا صحیح مفہوم متعین کیا جائے "

وہ لفظ جو قرآن کریم میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ دور نزول قرآن میں عربوں کے عام لٹریچر میں بھی یہ لفظ " قانون " ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود، نامعلوم وجوہات کی بناء پر اللہ کریم کی بیان کردہ اصطلاح " قدر " کا مفہوم " قانون " سے بدلنے کا سہو کیا گیا۔

اس کے بعد اس اصطلاح " قدر " کو " قانون " کا درجہ دے کر اس کے غیر متبدل ہونے کا فتویٰ بھی صادر فرمادیا گیا۔ چنانچہ کہا۔ کہ

" اگر ایسا کروگے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا، اور ایسا ہمیشہ ہوگا۔ یہ آخری شرط " قانون " کی اساس و بنیاد ہے۔ حکم کے معنی فیصلہ کے ہیں۔ جب کوئی حکم (فیصلہ) ایسی شکل اختیار کرلے کہ اس میں تبدیلی کا امکان نہ رہے، تو اسے " قانون " کہا جائے گا۔ بالفاظ دیگر " قانون " غیر متبدل فیصلے کو کہا جائے گا۔ خدا نے اشیاء کائنات کے جو فیصلے کئے ہیں، یعنی ان کے " پیمانے " مقرر کئے ہیں، وہ غیر متبدل ہیں "

اس مقام پر سوال یہ ہے کہ کیا اس خداوند قدوس نے، پورے قرآن میں کہیں بھی اپنی مقرر کردہ ان "قدروں" کو غیر متبدل قرار دیا ہے؟؟

کیا کائنات میں، اس رب کریم نے اپنی مرضی و منشاء کے تحت اپنی مقرر کردہ ان "قدروں" میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں کی؟؟

جناب پرویز علیہ رحمہ نے کس اختیار اور حق کو استعمال کرتے ہوئے، قرآن کریم کی ایک مخصوص اصطلاح "قدر" کو "قانون" میں تبدیل کر لیا؟

ایسے لفظ سے تبدیل کر لیا، جو بقول خود ان کے پورے قرآن میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔ قرآن ہی کیا، دور نزول قرآن میں عربوں کے عام لٹریچر میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔

کیوں اپنے ہی بیان کردہ ایک اصول کہ "" حقیقت یہ ہے کہ مسائل حیات کے متعلق بہت سی الجھنوں، پیچیدگیوں، اور کشمکشوں کی وجہ الفاظ کا غلط استعمال، یا ان کا غلط مفہوم ہے۔ اور قرآن کریم کے سمجھنے کا صحیح طریق یہ ہی ہے کہ اس کے الفاظ، اصطلاحات، یا تصورات (Concepts)، کا صحیح مفہوم متعین کیا جائے "کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، قرآن کریم کی مقرر کردہ ایک اصطلاح کو اپنی مرضی اور خواہش کا جامہ پہنانے کی دانستہ یا غیر دانستہ کوشش کی؟؟

کس نے دیا تھا یہ اختیار؟؟

جناب پرویز علیہ رحمہ کا یہ استدلال کہ "۔یاد رکھیے، خدا ایسا کر سکتا تھا کہ کائنات کو پیدا کر دیتا، لیکن اس کے لیے کوئی قائدہ یا قانون مقرر نہ کرتا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا کیا نہیں۔ اس نے اس کے لیے قوانین مقرر کر دیئے۔ وہ پھر ایسا بھی کر سکتا تھا، کہ اپنے مقرر کردہ قوانین کو جب جی چاہے بدل دے، لیکن اس نے کہا کہ ہم، ایسا کر سکنے کے باوجود ایسا کریں گے نہیں"

کس قدر غیر ذمہ دارنہ خیالات کا آئینہ دار ہے۔ کس طرح خدائے علیم و خبیر سے ایسی باتیں منسوب کر دی گئیں جو اس خدا نے اپنی کتاب عظیم میں کہیں بھی بیان نہیں کیں۔

وہ کون سی کتاب ہے جس میں اللہ کریم نے جناب پرویز علیہ رحمہ کو یہ اطلاع دی کہ اللہ کریم نے اس کائنات کے "قوانین" مقرر کیے ہیں، جو غیر متبدل ہیں؟؟

کس کتاب سے جناب پرویز علیہ رحمہ نے خدا کا یہ بیان حاصل کیا کہ "میں ان قوانین کو بدلنے کی طاقت رکھتا ہوں لیکن کبھی نہیں بدلوں گا"۔

اللہ کریم کے نام سے منسوب یہ الفاظ "لیکن اس نے کہا کہ ہم، ایسا کر سکنے کے باوجود ایسا کریں گے نہیں" کتاب اللہ کی کون سی سورہ اور کون سے آیت میں بیان ہوا ہے؟؟

کیا اس طرح کے خود ساختہ الفاظ، ذات باری تعالیٰ پر افتراء کے زمرے میں نہیں آتے؟؟

اَلْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

دوستو۔۔ وہ خدائے بزرگ وبرتر جو ساری کائنات کا مالک ہے۔ خالق ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اس کی طاقت، اس کا اقتدار، اس کا غلبہ، اس کی قوت، غیر متنازعہ ہے۔ مستحکم ہے۔ اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ نہ ہی اس کی اس طاقت کو کوئی چیلنج کر سکتا ہے۔ وہ "العزیز" ہے۔ عزیز کے معنی، ایسے غلبہ اور طاقت کے ہوتے ہیں، جسے چیلنج نہ کیا جا سکے۔

لیکن اس کے ساتھ، وہ "الحکیم" بھی ہے۔ آیئے اس لفظ "حکیم" کے معنی و مفہوم کو لغت سے سمجھتے ہیں۔ اس کا مادہ "ح ک م" ہے۔ عربی زبان میں "الحکمۃ" کے معنی ہیں فیصلہ میں عدل وانصاف کو ملحوظ خاطر رکھنا (تاج العروس)۔

یعنی ہر ایک کے حقوق کی حدیں مقرر کر کے کسی کو ان سے تجاوز نہ کرنے دینا۔ اس ہی لیے "حکیم" اس شخص کو بھی کہتے ہیں، جو ہر چیز کو صحیح تناسب اور توازن کے ساتھ، ہر تقاضے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے، نہایت حسن اتقان کے ساتھ بنائے، یا معاملات کو اس طرح سر انجام دے (تاج، محیط)۔

اس کو حکمت اس لیے کہتے ہیں کہ وہ جہالت اور نادانی کی باتوں سے روکتی ہے (ابن فارس)

قرآن کریم کو "حکیم" کہا گیا ہے (36:2)۔ کیونکہ وہ ہر شئے کا صحیح مقام متعین کر کے کسی کو ان حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ وہ تمام اختلافی امور میں صحیح فیصلے کرتا ہے۔

اللہ کریم کو بھی "الحکیم" کہا گیا ہے (2:32)۔ کیونکہ وہ کائنات کو ٹھیک راستے پر چلاتا ہے۔ ہر شئے کو صحیح اندازے اور تناسب کے مطابق پیدا کرتا ہے۔

لغات القرآن، صفحہ نمبر 534۔۔533، از پرویز علیہ رحمہ

چنانچہ اس رب کریم کے حوالے سے یہ بات سوچنا کہ وہ کوئی بھی کام، بغیر کسی حکمت کے کر دے گا۔ کہیں بھی توازن اور تناسب کو بگاڑ دے گا۔ کوئی بھی ایسا عمل کرے گا جو " حکمت " کے اصولوں کے خلاف ہو گا۔ انتہائی گمراہی اور کوتاہ بینی کا عمل ہو گا۔

اس رب کریم نے اپنی بے پناہ قوت اور غلبہ سے ہر شئے کو پیدا فرمایا۔ جیسا چاہا پیدا فرمایا۔ پھر اپنی حکمت بالغہ سے اس نے ہر شئے کے اندازے اور پیمانے مقرر کئے، اس جہت سے وہ "قدیر " کہلایا۔ اس نے کائنات کی ہر شئے کے نقطہ آغاز سے لے کر اس کی انتہا تک کے ہر مرحلے کے "اندازے " مقرر کیے۔ اور پھر اپنی قوت و غلبہ سے وہ ہر شئے کو اس کی ابتداء سے اس کی انتہا تک لے جارہا ہے۔ اس عمل میں وہ کوئی بھی کام بغیر حکمت کے نہیں کرتا۔

اگر پانی کا سیال حالت میں نشیب میں بہنا، اس رب کریم کی مقرر کردہ ایک "قدر " ہے، تو اس ہی رب عزو جل نے اس کی دوسری "قدر " بھی مقرر کی ہے کہ یہ ہی پانی ایک مخصوص درجہ حرارت پر بخارات بن کر ہوا میں اڑ جائے گا۔ اس کی مقرر کردہ پہلی "قدر " بھی اس کی حکمت پر مبنی تھی۔ اس ہی طرح اس کی مقرر کردہ دوسری "قدر " بھی اس کی حکمت پر ہی مبنی ہے۔

ہر دور کا انسان اپنے دور کے مشاہدات کی روشنی میں، یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ وہ آج دیکھ رہا، یہ ہی اس شئےٗ کا " قانون " ہے۔ غیر متبدل ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

چنانچہ جب اس ہی شئےٗ کی مقرر کردہ کسی دوسری " قدر " کا ظہور ہوتا ہے، تو عام انسان اسے " معجزہ " سمجھتا ہے۔ جب کے زیادہ روشن خیال لوگ اس کی مادی توجیہات میں لگ جاتے ہیں۔ اور اس طرح کے طفلانہ اور دیومالائی دلائل پیش کرتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

اگر یہ پانی سیال حالت میں نشیب کی طرف بہہ رہا تھا، تب بھی یہ اس رب کی مقرر کردہ ایک " قدر " تھی۔ اور اگر یہ ہی پانی درختوں میں نیچے سے اوپر کی طرف بہتا ہے ، تو یہ بھی اس رب کی ہی مقرر کردہ ایک " قدر " ہے۔ اور اگر انسان اس رب کی عطا کی ہوئی عقل سے ایک پمپ کے ذریعے اس پانی کو ہزاروں فٹ بلندی تک پہنچا رہا ہے، تو یہ بھی اس رب کی مقرر کردہ ایک " قدر " ہے۔

ایسا ہر گز نہیں ہے کہ وہ رب اپنی مقرر کردہ پہلی " قدر " کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ یا قانون شکنی کر رہا ہے۔

کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا کوئی بھی واقعہ، اس رب کریم کے مقرر کردہ " اندازوں اور پیمانوں " سے ماورا نہیں ہوتا۔ اس سے بالاتر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے مقرر کردہ " اندازوں اور پیمانوں " کے عین مطابق ہوتا ہے۔ البتہ عام انسان اپنی کم علمی کی بناء پر، اسے خرق عادت واقعہ سمجھ لیتا ہے۔ معجزہ سمجھ لیتا ہے۔

جب کہ زیادہ روشن خیال، عقلمند، اس کی سائنسی توجیہات، جیومیٹری اور الجبرا، کے اصولوں کے تحت کرنے لگ جاتے ہیں۔

آیئے۔۔۔۔۔ قرآن کریم کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ وہ رب کائنات کس طرح، اپنے مقرر کردہ "اندازوں اور پیمانوں" کے مطابق، مخصوص حالات میں مخصوص فیصلے کرتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ

1۔۔ تخلیق کائنات کے حوالے سے سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ یہ زمین سورج کا ایک حصہ تھی۔ جب یہ سورج سے علیحدہ ہوئی، تو اس وقت اس کا درجہ حرارت کئی ہزار ڈگری فارن ہائیٹ تھا، یہ آگ کے ایک گولے کی مانند تھی۔ قرآن کریم زمین کے اس ابتدائی دور کی ایک مخلوق کا ذکر کرتا ہے۔

خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ [٥٥:١٤]

اسی نے انسان کو ٹھیکری کی طرح بجتے ہوئے خشک گارے سے بنایا، [طاہر القادری]

وَخَلَقَ الْجَانَّ مِن مَّارِجٍ مِّن نَّارٍ [:]

اور جنّات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا، [طاہر القادری]

اس ہی مخلوق کی پیدائش کے حوالے سے دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ [١٥:٢٦]

اور بیشک ہم نے انسان کی (کیمیائی) تخلیق ایسے خشک بجنے والے گارے سے کی جو (پہلے) سِن رسیدہ (اور دھوپ اور

دیگر طبیعیاتی اور کیمیائی اثرات کے باعث تغیر پذیر ہو کر) سیاہ بودار ہو چکا تھا، [طاہر القادری]

وَالْجَآنَّ خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ مِن نَّارِ السَّمُومِ [۱۵:۲۷]

اور اِس سے پہلے ہم نے جنّوں کو شدید جلا دینے والی آگ سے پیدا کیا جس میں دھواں نہیں تھا، [طاہر القادری]

آیات بالا، انسان کی پیدائش سے قبل ایک اور مخلوق کی اس زمین پر موجودگی کا بیان کر رہی ہیں۔ یہ مخلوق آگ سے پیدا کی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں جب زمین کا درجہ حرارت ہزاروں ڈگری فارن ہائیٹ تھا، ہمارے دور کی کسی بھی مخلوق بشمول انسان، کی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کوئی ایسی مخلوق ہی زندہ رہ سکتی تھی جس کی تخلیق آگ سے ہوئی ہو۔ اس ضمن میں پرویز علیہ رحمہ اس طرح فرماتے ہیں۔

" ان تصریحات سے معلوم ہوا، کہ جن ایک آتشیں مخلوق تھی۔ جسے اللہ نے انسان سے پہلے پیدا کیا ۔یعنی ایسی مخلوق جس میں انسان کی نسبت حرارت زیادہ تھی۔ اس ہی اعتبار سے اس مخلوق کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ مخلوق آگ سے پیدا ہوئی تھی۔ جس طرح انسان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ مٹی سے پیدا ہوا ہے۔

لفظ "جن" کے معنی ہیں، پوشیدہ، مستور، نگاہوں سے اوجھل، غیر مرئی۔ جب یہ کرہ ارض سورج سے الگ ہوا ہے، تو ایک پگھلا ہوا آتشیں مادہ تھا۔ قرنہا قرن کے بعد، فضا کی برودت سے اس کا اوپر کا حصہ سخت ہونا شروع ہوا۔ جیسے دودھ پر بالائی جم جاتی ہے۔ لیکن نا معلوم اس کرہ نار کو کس قدر طویل المعیاد مراحل سے گزرنا پڑا، کہ بلآخر یہ ذی حیات آبادی کے قابل ہوا۔ تبدل و تحول کے ان ابتدائی ادوار میں

یہاں کس قسم کی مخلوق تھی، جسے اس کی آتشیں فضاء ساز گار تھی، اس کا ہمیں علم نہیں۔ لیکن وہ مخلوق اب قصہ پارینہ ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ انسانی آبادی نے لے لی۔ علم الانسان کے ماہرین، اسے سلسلہ ارتقاء کی گم گشتہ کڑی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کا اب تک حتمی طور پر سراغ نہیں لگ سکا"

ابلیس و آدم، صفحہ 97۔۔از پرویز علیہ رحمہ

سوال یہ ہے کہ کیا اس آتشیں مخلوق کی پیدائش، اور اس وقت اس زمین کا ماحول، اللہ کریم کے مقرر کردہ "اندازے اور پیمانے" اور پرویزؒ کے الفاظ میں "قانون" سے بالا تھی؟

اگر وہ بھی اللہ ہی کے کسی "قانون" کے تحت ہو رہا تھا، تو کیا اللہ کریم نے اپنے اس "قانون" میں تبدیلی نہیں کی؟

کیا اس وقت کی آتشیں زمین میں انسانوں کی حیات ممکن تھی؟

کیا اللہ کریم نے اپنے اس سابقہ "قانون" کو بدل کر اس زمین کا درجہ حرارت انسانی حیات کے لیے ساز گار نہیں بنایا؟

کیا آج زمین کا درجہ حرارت، اس کا ماحول، اللہ کریم کے مقرر کردہ "اندازے اور پیمانے" اور پرویزؒ کے الفاظ میں "قانون" کے مطابق نہیں ہے؟

اوپر موجود اقتباس میں پرویزؒ کے ان الفاظ پر غور فرمائیں

" تبدل و تحول کے ان ابتدائی ادوار میں یہاں کس قسم کی مخلوق تھی، جسے اس کی آتشیں فضاء ساز گار تھی، اس کا ہمیں علم نہیں۔ لیکن وہ مخلوق اب قصہ پارینہ ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ انسانی آبادی نے لے لی"

جس تبدل، و تحول کو خود پرویزؒ تسلیم کر رہے ہیں، کیا وہ سب ان کے الفاظ میں " قانون " سے بالاتر عمل تھا؟

کیا یہ تبدل و تحول، بغیر کسی " قانون " کے ہو رہی تھی؟

جس تبدل و تحول کو اس مقام پر خود پرویز علیہ رحمہ تسلیم کر رہے ہیں، اس کے حوالے سے وہ خود ہی دوسری جگہ یہ فتویٰ دے چکے ہیں کہ " قوانین خداوندی غیر متبدل ہوتے ہیں "

تو بتایا جائے کہ اس مقام پر یہ " قوانین " کس طرح تبدیل ہوئے؟

حقیقت یہ ہے۔ اس رب کائنات نے، اس زمین کی تخلیق کے وقت، اس کی ابتداء سے لے کر اس کی انتہا تک کے سارے مراحل کے " اندازے اور پیمانے " جسے وہ " قدر " کہتا ہے، مقرر فرمادیئے۔

اس نے ابتداء میں ہی یہ طے کر دیا کہ شروع میں زمین ایسے ہو گی، اس میں ایسا ماحول ہو گا، اس میں ایسی مخلوق ہو گی، پھر کچھ عرصہ کے بعد، یہ زمین ایسی ہو جائے گی، اس میں فلاں مخلوق فنا ہو جائے گی، فلاں مخلوق آباد ہو جائے گی۔

یہاں تک کہ آج ہمارے دور میں زمین کا جو ماحول ہے، جو حالات ہیں، یہ بھی غیر متبدل نہیں ہیں۔ ابھی ہم نہیں جانتے کہ آنے والے ہزاروں، لاکھوں سالوں کے بعد یہ زمین کیسے ہو گی، اس میں کس طرح کی مخلوق ہو گی، اس میں کس طرح کے حالات ہوں گے۔ لیکن اس باری تعالیٰ کے علم میں یہ سب کچھ موجود ہے۔

چنانچہ اس زمین کی تخلیق کی ابتداء سے لے کر، تا قیامت جتنے بھی مراحل ہوں گے ، اس رب کریم کے مقرر کردہ "اندازوں اور پیمانوں" کے مطابق ہوں گے۔ ہر نئے مرحلے پر ، اللہ کی مقرر کردہ ایک " تقدیر "نافذ العمل ہو گی۔ اس کے یہ معنی ہر گز نہیں ہیں کہ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ، اللہ کریم اپنے وعدوں اور قوانین سے مکر گیا، قانون شکنی کا مرتکب ہو گیا۔ یہ انسان کی اپنی کم علمی اور کوتاہ بینی ہے کہ وہ اپنے دور کے مشاہدے کو حرف آخر سمجھ لیتا ہے۔

2۔۔ تخلیق انسانی کی ابتدا ایسے انسان سے ہوئی، جس کا نہ باپ تھا، اور نہ ماں تھی۔ وہ انسان آج کے دور کے قانون تخلیق و تولید، سے بلکل مختلف طریقہ سے پیدا ہوئے۔ اب کیا ہم یہ کہیں کہ اس وقت انسان کی پیدائش، بغیر کسی "اندازے، پیمانے "یا پرویزؒ کے الفاظ میں "قانون "سے بالاتر ہوئی تھی؟

یقیناً ایسا نہیں تھا۔ اس وقت جو کچھ بھی ہوا، وہ بھی کسی نہ کسی "قانون "کے تحت ہوا ہو گا۔

لیکن آج یہ ہی عمل، تولید و تناسل کے تحت ہوتا ہے۔

تو کیا تخلیق انسانی کا آج کا عمل، کسی "اندازے، پیمانے " یا پرویزؒ کے الفاظ میں کسی " قانون "سے ماورا ہے ؟

تو کیا اس رب کائنات نے، تخلیق انسان کا صدیوں پہلے کا " قانون " تبدیل نہیں کیا؟؟

تو کیا معاذ اللہ ہم یہ کہیں گے کہ اللہ کریم نے قانون شکنی کی ؟

حقیقت کیا ہے، کہ اس رب کائنات نے، انسانی تخلیق کی ابتداء سے اس کی انتہا تک کے ہر مرحلے کی ایک "تقدیر " طے کر دی۔ وہ اپنے مقرر کردہ "اندازوں اور پیمانوں " کے مطابق، یہ عمل جاری رکھے ہوئے ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ جس طریقہ سے آج انسان کی تخلیق ہو رہی ہے، وہ اس خدا کی مقرر کردہ "تقدیر " کا حرف آخر ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ آئندہ ہزاروں لاکھوں سال کے بعد، انسانی تخلیق ، اس خدائے باتدبیر کے کس " اندازے اور پیمانے "کے مطابق ہو گی۔

3۔۔ خدائے بزرگ وبرتر نے، اس کتاب عظیم کے حوالے سے ارشاد فرمایا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ [١٥:٩]

بیشک یہ ذکرِ عظیم (قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے، [طاہر القادری

لیکن اس ہی خدا نے سابقہ کتب آسمانی کے لیے ارشاد فرمایا۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ [۳:۳]

(اے حبیب!) اسی نے (یہ) کتاب آپ پر حق کے ساتھ نازل فرمائی ہے (یہ) ان (سب کتابوں) کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے اتری ہیں اور اسی نے تورات اور انجیل نازل فرمائی ہے، [طاہر القادری]

مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ ۗ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ [۳:٤]

(جیسے) اس سے قبل لوگوں کی رہنمائی کے لئے (کتابیں اتاری گئیں) اور (اب اسی طرح) اس نے حق اور باطل میں امتیاز کرنے والا (قرآن) نازل فرمایا ہے، بیشک جو لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ان کے لئے سنگین عذاب ہے، اور اللہ بڑا غالب انتقام لینے والا ہے، [طاہر القادری]

غور فرمائیں۔ تمام کی تمام کتب آسمانی، اللہ کی طرف سے نور، وہدایت ہوتی ہیں، بلکل ویسی ہی جیسی یہ کتاب عظیم قران حکیم ہے۔ لیکن اس رب کائنات نے قرآن کریم سے پہلے کی کتابوں کی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا۔ چنانچہ ان میں تحریف وقوع پذیر ہو گئی۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس رب کریم نے قرآن کریم سے پہلے کی کتابوں کی حفاظت نہیں فرمائی، تو یہ بھی اس ہی کے مقرر کردہ کسی "قدر" کے مطابق ہو گی۔

اب جو اس کتاب عظیم کی حفاظت فرمارہا ہے، تو یہ بھی اس ہی کی مقرر کردہ کسی نہ کسی "قدر" کے مطابق ہو گا ۔ اگر ہم اس عمل کو ایک قانون کا درجہ دے دیں، تو لازم تھا کہ وہ خدا اپنی نازل کردہ تمام کی تمام کتب آسمانی کا تحفظ کرتا۔

تو کیا ہم یہ کہیں کہ اللہ نے معاذ اللہ، کتب سابقہ کی حفاظت نہ کر کے، قانون شکنی کی؟؟

حقیقت کیا ہے کہ اللہ کریم نے انسانوں کی راہنمائی کے لیے ، جب تک مناسب سمجھا ، اپنے مقرر کردہ " اندازوں اور پیمانوں" کے مطابق کتب آسمانی نازل فرمائیں۔ چونکہ ساری انسانیت کے لیے اس نے پہلے ہی ایک کتاب عظیم " قرآن" کے نزول کا " اندازہ " مقرر کیا ہوا تھا، اس لیے قرآن کریم سے پہلے کی کتب آسمانی کا محفوظ رکھنا، مناسب نہ تھا۔ اس لیے اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی نہیں لی گئی۔ اب چونکہ اس کتاب کو تا قیامت انسانوں کی راہنمائی کرنی ہے اس لیے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اس رب نے اپنے اوپر لے لیا۔

4-۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَن سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا [٤:١٦٠]

پھر یہودیوں کے ظلم ہی کی وجہ سے ہم نے ان پر (کئی) پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو (پہلے) ان کے لئے حلال کی جاچکی تھیں، اور اس وجہ سے (بھی) کہ وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے بکثرت روکتے تھے، [طاہر القادری]

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِن قَبْلُ ۖ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ [١٦:١١٨]

اور یہود پر ہم نے وہی چیزیں حرام کی تھیں جو ہم پہلے آپ سے بیان کر چکے ہیں اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا تھا لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے، [طاہر القادری]

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ [٦:١٤٦]

اور یہودیوں پر ہم نے ہر ناخن والا (جانور) حرام کر دیا تھا اور گائے اور بکری میں سے ہم نے ان پر دونوں کی چربی

حرام کر دی تھی سوائے اس (چربی) کے جو دونوں کی پیٹھ میں ہو یا اوجھڑی میں لگی ہو یا جو ہڈی کے ساتھ ملی ہو۔ یہ ہم نے ان کی سرکشی کے باعث انہیں سزا دی تھی اور یقیناً ہم سچے ہیں، [طاہر القادری]

آیات بالا سے، یہ بات سامنے آتی ہے، کہ اللہ کریم نے یہودیوں پر ایسی اشیاء کو حرام قرار دے دیا تھا، جو ازروئے قرآن، مسلمانوں پر حلال ہیں۔ ظاہر ہے کہ خداوند عزوجل نے، یہودیوں پر جن اشیاء کو حرام قرار دیا، وہ بھی کسی نہ کسی "ضابطہ، قدر" اور پرویزؒ کے الفاظ میں "قانون" کے مطابق ہی ہو گا۔

ان ہی اشیاء کو مسلمین کے لیے حلال قرار دے دیا۔ تو یہ حلت بھی کسی نہ کسی " ضابطہ، قدر، قانون" کے مطابق ہو گا۔

دور نزول قرآن میں ایک طرف یہ یہودی تھے، جن کے پاس ان کی کتاب تورات موجود تھی، جو ان یہودیوں کو ان اشیاء کی حرمت کا حکم دے رہی تھی۔ لیکن اس وقت اللہ کا رسول ﷺ اپنی کتاب، قرآن کریم کی رو سے ان اشیاء کو حلال قرار دے رہا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ [٧:١٥٧]

(پس آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصہ ہے) جو اِس پیغمبر، نبی امی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر اُنہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بند شیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اُس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں [ابو الاعلی مودودی]

سوال یہ ہے کہ کیا اللہ کریم نے اپنے مقرر کردہ "اندازوں اور پیمانوں" میں تبدیلی کرلی؟

کیا ہم یہ کہیں کہ خدا نے معاذ اللہ قانون شکنی کی؟؟

ایک ہی وقت میں اللہ کی نازل کردہ دو کتابیں، دو مختلف "قدروں" کو ظاہر کر رہی تھیں۔ تو کیا یہ بات اپنے آپ میں ایک ثبوت نہیں ہے کہ اللہ کریم اپنی مخلوق کو کسی نام نہاد "علت و معلول" کے دائرے کا قیدی بنا کر مھجور و مجبور بن کر ایک طرف نہیں بیٹھ گیا۔ بلکہ وہ حالات و ضروریات کے تحت اپنے فیصلے صادر کرتا ہے۔

5۔۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔۔

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي ۙ فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ [۷:۳۵]

اے اولادِ آدم! اگر تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں جو تم پر میری آیتیں بیان کریں پس جو پرہیز گار بن گیا اور اس نے (اپنی) اصلاح کرلی تو ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ (ہی) وہ رنجیدہ ہوں گے، [طاہر القادری]

غور فرمائیں، اللہ کا یہ خطاب تمام بنی نوع آدم کے ساتھ ہے۔ اس کا مخاطب ہم بھی ہیں۔ اقوام سابقہ پر اللہ کریم نے متواتر انبیاء کو مبعوث کیا۔ لیکن ایک مرحلے پر آکر اس نے انبیاء علیہ سلام کا آنا منقطع کر دیا۔ کیا ہم اسے معاذ اللہ، اللہ کریم کی قانون شکنی کہیں گے ؟؟

انبیاء علیہ سلام کی بعثت، بھی اللہ کریم کا مقرر کر دہ "اندازہ اور پیمانہ " تھا۔ اور اس سلسلہ رشد و ہدایت کا ایک مقام پر انقطاع، بھی اس ہی رب کریم کا مقرر کر دہ کوئی "اندازہ اور پیمانہ " ہے۔

وہ لوگ جو نبی اکرم ﷺ سے پہلے گزرے، ان کے لیے تو انبیاء علیہ سلام کا آنا، ایک اٹل قانون خداوندی ہی تھا۔

لیکن حقیقت تو یہ ہی ہے کہ جب تک اللہ نے اپنی حکمت بالغہ سے مناسب سمجھا، اس سلسلہ کو جاری رکھا۔ جس مقام پر آکر مناسب سمجھا، اس سلسلہ کو منقطع کر دیا۔

انبیاء علیہ سلام کی آمد، پھر اس سلسلہ کا انقطاع خود اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ وہ خدا اپنی دنیا کو بنا کر ایک طرف ہو کر نہیں بیٹھ گیا۔ وہ اپنی حکمت بالغہ سے جب چاہے جس طرح چاہے، جو چاہے فیصلے کرتا ہے۔ اس کا ہر فیصلہ، اس کے طے کئے ہوئے "اندازوں" ہی کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن انسان اپنی کم فہمی کی وجہ سے اپنے دور کے مشاہدات کو ہی اللہ کا حتمی قانون سمجھ لیتا ہے۔

6--

متعدد ایسے اور بھی دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں، لیکن مضمون کی طوالت کا خدشہ، مانع ہے۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ ہمارے بہت سارے ایسے احباب، جن کے لیے جناب پرویز علیہ رحمہ ہی حجت ہیں ،سند ہیں۔ وہ اس وقت تک مطمئین نہ ہوں گے جب تک ایک مثال جناب پرویز علیہ رحمہ کی طرف سے ہی نہ پیش کر دوں۔۔

پرویز علیہ رحمہ فرماتے ہیں۔۔

" قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ سلام کے تذکرہ جلیلہ کے ضمن میں ہے کہ جب انہیں پہلی مرتبہ طور پر (نبوت سے سرفراز کرنے کے لیے) بلایا گیا تو ان سے کہا گیا کہ نبوت تمہیں یوں ہی اتفاقیہ نہیں مل گئی کہ آگ لینے آئے تو پیغمبری مل جائے۔ اس کے لیے تمہیں پہلے سے تیار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ تم اس طرح پیدا ہوئے، اس طرح تمہاری پرورش ہوئی۔ اس طرح تم مدین کی طرف آئے، اس طرح تم نے گلہ بانی کی، اس طرح تمہاری تربیت ہوئی۔ اور یوں ان مختلف مراحل سے گزر کر۔۔ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَا مُوسَىٰ [٢٠:٤٠] تم، اے موسیٰ، اس اندازے تک پہنچ گئے۔ اس پیمانے کے مطابق بن گئے، جو نبوت کے لیے مقرر تھا۔

اور یہ سب خدا کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق ہوا۔ یہاں لفظ "قدر" نے اپنا مفہوم واضح کر دیا ہے"

لغات القرآن، صفحہ نمبر 1336۔ از پرویزؒ

اس مضمون میں ہم نے پہلے ہی پرویز علیہ رحمہ کی وہ تحریر پیش کر دی ہے، جس کی رو سے انہوں نے خدائے بزرگ و برتر کی اصطلاح "قدر" کو، قانون کا درجہ دے کر اسے غیر متبدل قرار دیا ہے۔۔ چنانچہ

اس اقتباس بالا سے پرویز علیہ رحمہ، ان تمام مراحل کو، جو حضرت موسیٰ علیہ سلام کی زندگی میں وقوع پذیر ہوئے، اسے نبوت کے منصب کی اہلیت کا " قانون "ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

وہ آیات مبارکہ جن میں یہ سارا واقعہ بیان ہوا ہے، ان کا درست مفہوم کیا ہے، اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ لیکن میں اس مقام پر ایک سوال اٹھانا چاہتا ہوں۔ کہ اگر منصب نبوت کے تقاضے یہ ہی ہیں" قانون "یہ ہی ہے، تو کیا خدا نے تمام انبیاء علیہ سلام کو بھی ان ہی مراحل سے گزارا؟

دور کیوں جائیں، خود حضرت موسیٰ علیہ سلام کے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ سلام کی نبوت پر ہی غور کر لیا جائے۔ قرآن کریم سے تو حضرت ہارون علیہ سلام کے لیے یہ تاثر ملتا ہے کہ انہیں نبوت حضرت موسیٰ علیہ سلام کی درخواست پر ملی۔ اب اگر منصب نبوت کا قانون یہ ہوتا جو حضرت موسیٰ علیہ سلام کے ضمن میں بیان ہوا ہے، تو کیا اللہ کریم نے حضرت ھارون علیہ سلام کے ضمن میں اپنے ہی قانون کی خلاف ورزی کی؟؟

حقیقت کیا ہے۔ یہ ہی نہ کہ اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ سلام کو ان کی ذمہ داریوں کے مطابق، اپنے اندازوں سے تراشا۔ جب کہ حضرت ھارون علیہ سلام کو ان کی ذمہ داریوں کے مطابق۔

اس مقام پر پرویز علیہ رحمہ کی تحریر کا ایک اقتباس دوبارہ بیان کر دینا، مناسب نظر آتا ہے۔ پرویزؒ، فرماتے ہیں۔

" یہ ہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ایک خدا فراموش مادہ پرست اور ایک حق شناس عبد مومن کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اول الذکر اس مقام سے آگے وادی حیرت کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی آماجگاہ بناتا ہے اور اس طرح خود بھی ٹھوکریں کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی راہ سے گم کرتا ہے۔ لیکن ایک حکیم مومن وہاں پہنچ کر بلا تامل پکار اٹھتا ہے کہ اس سلسلہ دراز کی ابتداء اس قادر مطلق کی "اسباب فراموش مشیت اور علل نا آشنا صمدیت کی رہین منت ہے، جو طبعی سلاسل اسباب و ذرائع سے مستغنی اور علائق و علل سے بے نیاز ہے" وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت عظمیٰ کا اعلان کرتا ہے اور اس طرح حیرت و استعجاب کی وہ وادی جو اس خدا فراموش محقق کی قیاس آرائیوں سے تیرہ و تار ہو چکی تھی اس مرد خود آگاہ و خدا مست کی مشعل ایمان و شمع ایقان سے جگمگا اٹھتی ہے"

ابلیس و آدم، باب اول انسان، صفحہ 02 از جناب پرویز علیہ رحمہ

یہ ہی سچ ہے۔ جب کوئی انسان اپنے رب کی عطا کی ہوئی ہدایت کے مقابلے میں اپنی عقل و فہم کو ترجیح دے۔ اپنے ذہن میں قائم خود ساختہ عقائد و نظریات کو ہی حرف آخر سمجھے، اور اللہ کی کتاب سے اپنے ان باطل عقائد و نظریات کو مستند کرنے کی کوشش کرے، تو پھر سوائے گمراہی کے اس انسان کے حصے میں اور کیا آسکتا ہے۔

اپنی اس روش کے نتیجہ میں انسان خود بھی راہ گم کردہ میں شمار ہوتا ہے، اور اپنے پیچھے کتنے ہی اور انسانوں کو منزل سے بھٹکا دیتا ہے۔

قرآن کریم میں "قدر" کے علاوہ، کچھ مزید اصطلاحات، سنت اللہ، وعدہ اللہ، کلمۃ اللہ، بھی استعمال ہوئی ہیں۔ ان اصطلاحات کے معنی و مفہوم میں بھی، اپنے عقائد و نظریات کی بناء پر، گمراہ کن تبدیلیاں کی گئیں۔ من مانے معنی متعین کئے گئے۔ پھر ان خود ساختہ معنی و مفہوم کے تناظر میں، آیات خداوندی کی ایسی توجیہات بیان کی گئیں، جس سے قرآن کریم کی بنیادی تعلیم ہی مسخ ہو کر رہ گئی۔

ان اصطلاحات کے متعلق جناب پرویز علیہ رحمہ فرماتے ہیں۔

" قانون خداوندی کے لیے قرآن کریم میں دو الفاظ آئے ہیں۔ ایک " کلمۃ اللہ" اور دوسرے " سنت اللہ "۔ قرآن پر تدبر سے ان دونوں میں یہ فرق سامنے آجاتا ہے کہ کلمہ، قانون کی نظری حیثیت ہے۔ جسے فارمولا کہا جا سکتا ہے، اور سنت اللہ اس فارمولا کی عملی شکل۔ یعنی جب وہ نظری قانون، عملی پیکر اختیار کرے، تو اسے سنت اللہ سے تعبیر کیا جائے گا۔ یعنی وہ روش جس پر خدا چل رہا ہے، یا جس پر کائنات کو چلا رہا ہے۔ یہ دونوں غیر متبدل ہیں۔ سورہ انعام میں ہے۔ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ [٦:٣٤]۔ کلمات اللہ (قوانین خداوندی) کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ (6:116)، (18:27)۔۔ دوسری جگہ ہے۔۔۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ [١٠:٦٤]۔ کلمات اللہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

سنت اللہ کے سلسلہ میں سورہ احزاب میں ہے۔ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا [٣٣:٦٢] خدا کی یہ ہی سنت (روش) اقوام سابقہ کے سلسلہ میں بھی رہی ہے (اور یہ ہی قوم مخاطب کی صورت میں رہے گی)، تو سنت اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔ (40:85)، (48:23) دوسرے

مقامات پر، تبدیل کی جگہ تحویل کا لفظ آیا ہے۔یعنی روش خداوندی اپنا رخ تک نہیں بدلتی (17:77)،(35:43)

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، کہ عالم خلق میں آکر "خدا کا امر" "قدر مقدور" ہو جاتا ہے۔یعنی وہ مقرر کردہ پیمانوں کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔اسی کو قرآن میں "سنت اللہ" کہا گیا ہے۔سورہ احزاب میں ہے۔ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا [۳۳:۳۸] خدا کی روش اقوام سابقہ کے بارے میں یہ ہی رہی ہے، یہ اس لیے کہ (عالم خلق میں) خدا کا امر پیمانوں کے ظروف میں ڈھل جاتا ہے ۔وہ غیر متبدل قانون کی شکل اختیار کر لیتا ہے"

کتاب التقدیر، صفحہ نمبر 44،43،از جناب پرویزؒ

مذکورہ بالا اقتباس کا پہلا جملہ دوبارہ ملاحظہ فرمائیں" قانون خداوندی کے لیے قرآن کریم میں دو الفاظ آئے ہیں۔ایک "کلمۃ اللہ" اور دوسرے "سنت اللہ"۔۔۔لیکن اس لفظ "قانون" کے لیے جناب پرویزؒ نے کیا فرمایا ہے اسے بھی دوبارہ ملاحظہ فرمائیں" قرآن کریم میں "قانون" کا لفظ نہیں آیا،اس زمانے کے عربی لٹریچر میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں بہت کم نظر آتا ہے"۔۔

کتاب التقدیر صفحہ نمبر 38

ذرا غور فرمائیں، اپنے ہی بیان کے تضاد پر۔ایک ایسا لفظ جس کا قران کریم میں کوئی وجود ہی نہیں یہاں تک کہ دور نزول قرآن میں، عربوں کے عام لٹریچر تک میں نہیں۔کس دھڑلے کے ساتھ، اس کے

متعلق دعویٰ کیا جارہاہے۔۔۔ کہ " قانون خداوندی کے لیے قرآن کریم میں دو الفاظ آئے ہیں۔ ایک " کلمۃ اللہ " اور دوسرے " سنت اللہ "

اس ہی کا نام ذہن سازی ہوتا ہے۔ پہلے ایک لفظ کے معنی و مفہوم کو اپنی مرضی و منشاء کا لباس دینا۔ پھر اس مفہوم کو جابجا اس طرح استعمال کرنا، کہ اس لفظ کا حقیقی معنی و مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہو جائے، اور یہ نیا مفہوم، اصل بن کر سامنے کھڑا ہو جائے۔ یہ ہی وہ المیہ ہے، جو ہمارے دور کے بہت سارے دوستوں کے ساتھ نتھی ہو گیا ہے۔

ان دوستوں کے ذہن میں ان اصطلاحات "قدر، سنت اللہ ، کلمۃ اللہ، وعدہ اللہ " وغیرہ کا معنی و مفہوم " قانون " رائج کر دیا گیا ہے، ذہن بنا دیا گیا ہے کہ ان اصطلاحات کا مفہوم " قانون خداوندی " ہوتا ہے۔ بس اس کے بعد، جس جگہ دل کیا، اس " قانون " کو نافذ کر دیا۔ غیر متبدل اور اٹل۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ " سنت اللہ " اور " کلمۃ اللہ " اٹل ہیں، غیر متبدل ہیں، ناقابل تحول ہیں۔ یقیناً اللہ کی سنت کبھی نہیں بدلتی۔ اللہ کے کلمات ہمالیہ سے زیادہ مستحکم، اور اٹل ہیں۔

لیکن اس بات کا فیصلہ اس خدائے وحدہ لاشریک کے علاوہ، کون کرے گا کہ کون سی بات " سنت اللہ " ہے۔ " کلمۃ اللہ " کسے کہتے ہیں؟ کس شئے کو " وعدہ اللہ " کہا گیا ہے؟

جس طرح "قدر" کے ضمن میں، آیات قرآنی کے کچھ حصوں کا استحصال کر کے، ان کا آپریشن کر کے، ان کو اپنی مرضی و منشاء کا مفہوم دے کر، حقیقت کو بدلنے کی کوشش کی گئی، جسے ہم نے قرآن کریم کی

متعلقہ آیات کو مکمل طور پر پیش کر کے ثابت کر دیا ہے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ بلکل یہ ہی صورتحال ان قرآنی اصطلاحات "سنت اللہ" اور "کلمۃ اللہ" کے ساتھ بھی ہے۔

جن آیات مبارکہ کے آخری ٹکڑے پیش کر کے، ان کو اپنے غیر قرانی عقائد و نظریات کو درست ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے، وہ ساری آیات مبارکہ پیش خدمت ہیں۔ ان پر تفکر و تدبر فرمائیں، کہ کیا شئے ہے جسے اللہ کریم اپنی "سنت" قرار دے رہے ہیں۔ اور کس شئے کو اللہ کریم نے اپنا "کلمہ" قرار دیا ہے۔ اور کس شئے کو اللہ کریم نے اپنا "وعدہ" قرار دیا ہے۔

وعدہ

اللہ کے وعدے اپنی جگہ اٹل ہیں۔ غیر متبدل ہیں۔ لیکن یہ قانون نہیں ہیں۔

کیونکہ قانون ہمہ گیر ہوتا ہے، عالمگیر ہوتا ہے۔

لیکن وعدہ کسی نہ کسی شرط سے مشروط ہوتا ہے۔ ایک سے کیا ہوا وعدہ دوسرے پر نافذ نہیں ہوتا۔ نہ ہی حجت ہوتا ہے۔۔

ملاحظہ فرمائیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔۔

وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ۚ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ [۹:۷۲]

اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے جنتوں کا وعدہ فرما لیا ہے جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور ایسے پاکیزہ مکانات کا بھی (وعدہ فرمایا ہے) جو جنت کے خاص مقام پر سدا بہار باغات میں ہیں، اور (پھر) اللہ کی رضا اور خوشنودی (ان سب نعمتوں سے) بڑھ کر ہے (جو بڑے اجر کے طور پر نصیب ہوگی)، یہی زبردست کامیابی ہے، [طاہر القادری]

آپ غور فرمائیں۔ یہاں اللہ کریم ایک وعدہ فرما رہے ہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ یہ اٹل بھی ہے اور غیر متبدل بھی ہے۔ لیکن آپ دیکھیں یہ مومنین سے مشروط ہے۔۔ غیر از مومن، اللہ سے اس وعدے کے ایفا کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اللہ کا یہ وعدہ، غیر از مومن پر لاگو نہیں ہوتا۔۔

مزید ارشاد فرمایا۔۔

وَعَدَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ [۹:۶۸]

ان منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں کے لیے اللہ نے آتش دوزخ کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہی ان کے لیے موزوں ہے ان پر اللہ کی پھٹکار ہے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے [ابوالاعلی مودودی]

اس آیت مبارکہ پر غور فرمائیں۔ اللہ کریم کی یہ بات بھی اٹل ہے۔۔ لیکن یہ قانون نہیں ہے۔۔ یہ وعدہ منافقین، اور کفار سے مشروط ہے۔۔ اس وعدے یا بات کا اطلاق مومنین پر نہیں ہو گا۔۔

مزید ارشاد فرمایا۔۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۖ وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ [۳۵:۵]
إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا ۚ إِنَّمَا يَدْعُو حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ [۳۵:٦]
الَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ [۳۵:۷]

اے لوگو! بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے سو دنیا کی زندگی تمہیں ہرگز فریب نہ دے دے، اور نہ وہ دغاباز شیطان تمہیں اللہ (کے نام) سے دھوکہ دے۔۔ بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے سو تم بھی (اس کی مخالفت کی شکل میں) اسے دشمن ہی بنائے رکھو، وہ تو اپنے گروہ کو صرف اِس لئے بلاتا ہے کہ وہ دوزخیوں میں شامل ہو جائیں۔۔ کافر لوگوں کے لئے سخت عذاب ہے، اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ان کے لئے مغفرت اور بہت بڑا ثواب ہے،
[طاہر القادری

غور فرمائیں۔۔ یہاں ساری انسانیت کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔۔ لیکن پھر بھی یہ مشروط ہے ان لوگوں سے جو ایمان لائے، یا کفر کیا۔۔

قانون ہمہ گیر ہوتا ہے۔ سب پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔ سوائے ان استثنیات کے جو قانون بناتے وقت طے کر دی جائیں، ناقابل تغیر ہوتا ہے۔ لیکن سنت اللہ، وعدہ اللہ وغیرہ ایک مخصوص کیفیت اور حالت

کے تناظر سے مشروط ہیں۔ وہ ایک محدود دائرہ میں نافذ العمل ہوتے ہیں۔۔ ان کا اطلاق قانون کے طور پر ہر کسی پر نہیں کیا جاسکتا۔۔

سنت اللہ

قرآن کریم میں آٹھ آیات مبارکہ میں " سنت اللہ " کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جس کے متعلق پرویزؒ کا یہ خیال ہے کہ جو بات سنت کہہ کر بیان کی جارہی ہے وہ خدائی قانون ہے۔ میرے نقطہ نظر کے مطابق ، یہ غلط نگہی ہے۔ آیئے پہلے اس لفظ " سنت " کے حقیقی مفہوم کو سمجھتے ہیں۔

عربی زبان میں سنت کے معنی " روش " کے ہیں۔ طریقہ کے ہیں۔ اس کا معنی قانون ہوتا ہی نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایک اصطلاح " سنت رسول اللہ " عام ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ رسول اللہ نے کوئی قانون بیان کیا ہے۔ بلکہ اس کے معنی مختلف حالات میں حضور اکرم ﷺ کیا عمل کیا۔ کیا حکمت عملی اختیار کی۔

اب کچھ معاملات دین کے حوالے سے ہیں۔ ان میں حضور اکرم ﷺ کی حکمت عملی ہمارے لیے لازماً واجب الاتباع ہے۔ (اس مرحلہ پر میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہمیں حضور اکرم ﷺ کی مستند سنت کیسے ملے گی، اس کا کیا پیمانہ ہو گا)

لیکن حضور اکرم ﷺ کا کوئی عمومی عمل جو دین سے متعلق نہ ہو، بلکہ اس کا تعلق عام معمولات زندگی سے ہو، وہ کسی مومن پر لازماً نافذ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر حضور ﷺ ،لوکی شوق سے کھایا کرتے تھے، تو کسی مومن کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ بھی لوکی کھائے۔ اگر حضور ﷺ کو کالا رنگ پسند تھا، تو عام مومن پر ہر گز یہ لازم نہیں کہ وہ کالے کپڑے پہنے۔

اب یہ پوزیشن قانون کی نہیں ہوتی۔ قانون میں پسند، ناپسند کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ زانی کی سزا سو کوڑے ہے یہ خدائی قانون ہے۔ یہ ہر حال میں، ہر جگہ، ہر حالت میں نافذ ہے۔ اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ خواہ کسی کو پسند آئے یا نہ آئے۔

کلمات اللہ

عربی زبان میں "کلمہ" کے معنی ایک لفظ، ایک بات، ایک جملہ، یا ایک قصیدہ، یا ایک خطبہ، ہے۔ کلام کے معنی "بات"۔۔

(تاج العروس، صاحب محیط، لغات القرآن جناب پرویزؒ)

کسی نبی یا رسول سے آخری بار اللہ کا کلام یہ قرآن کریم ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ من جانب اللہ ہے۔

(بد قسمتی سے اب یہ بھی بحث کی جاتی ہے کہ نہیں قرآن کے الفاظ ہو بہو، من جانب اللہ نہیں ہیں۔ بلکہ حضور ﷺ نے پہلے اللہ کا پیغام سنا، اسے سمجھا، اور پھر اپنی زبان میں، آسان کر کے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا۔ یہ بات کہتے ہوئے ہمارے دوست یہ نہیں سوچتے کہ اس عقیدہ سے اس خدا کا کیا تصور قائم ہوتا

ہے، کہ معاذ اللہ۔۔۔وہ خدا اتنا علم بھی نہیں رکھتا تھا کہ اپنے عام بندوں کو، آسان الفاظ میں اپنا ماضی الضمیر سمجھا سکے۔ان کی راہنمائی کر سکے)

یہ قرآن سارے کا سارا "کلام اللہ" ہے۔اس کے الفاظ اپنی جگہ اٹل ہیں۔غیر متبدل ہیں۔اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے۔چنانچہ ان آیات مبارکہ میں جہاں "لا تبدیل کلمات اللہ" کہ الفاظ آئے ہیں، یعنی جو باتیں اللہ کریم نے اس کتاب (القرآن) میں فرمادی ہیں، وہ اٹل ہیں، ہو کر رہیں گی۔

قرآن کریم میں کلمات اللہ کے حوالے سے چند آیات۔۔۔

وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ ۖ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَن تَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَدًا [١٨:٢٧]

اور آپ وہ (کلام) پڑھ کر سنائیں جو آپ کے رب کی کتاب میں سے آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے، اس کے کلام کو کوئی بدلنے والا نہیں اور آپ اس کے سوا ہرگز کوئی جائے پناہ نہیں پائیں گے۔[طاہر القادری]

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ ۖ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ [:]وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَإِ الْمُرْسَلِينَ [٦:٣٤]

(اے حبیب!) بیشک ہم جانتے ہیں کہ وہ (بات) یقیناً آپ کو رنجیدہ کررہی ہے کہ جو یہ لوگ کہتے ہیں، پس یہ آپ کو نہیں جھٹلا رہے لیکن (حقیقت یہ ہے کہ) ظالم لوگ اللہ کی آیتوں سے ہی انکار کررہے ہیں، اور بیشک آپ سے قبل (بھی بہت سے) رسول جھٹلائے گئے مگر انہوں نے جھٹلائے جانے اور اذیت پہنچائے جانے پر صبر کیا حتٰی کہ انہیں

ہماری مدد آپہنچی، اور اللہ کی باتوں (یعنی وعدوں کو) کوئی بدلنے والا نہیں، اور بیشک آپ کے پاس (تسکینِ قلب کے لیے) رسولوں کی خبریں آچکی ہیں، [طاہر القادری]

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِّن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ [:]وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ [٦:١١٥]

پھر جب حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں، حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کر دی ہے؟ اور جن لوگوں کو ہم نے (تم سے پہلے) کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب ہی کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔۔ تمہارے رب کی بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے، کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے [ابوالاعلی مودودی]

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ [:.]الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ [:.]لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ [:.]وَلَا يَحْزُنكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۚ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ [١٠:٦٥]

سُنو! جو اللہ کے دوست ہیں، جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ دُنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں

یہی بڑی کامیابی ہے۔۔ اے نبیؐ، جو باتیں یہ لوگ تجھ پر بناتے ہیں وہ تجھے رنجیدہ نہ کریں، عزّت ساری کی ساری خدا کے اختیار میں ہے، اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[ابو الا علی مودودی]

آپ آیات بالا پر غور و خوض فرمائیں۔ کیا کہا جارہا ہے۔ اللہ کریم اپنے رسول کی دل جوئی فرمارہے ہیں، انہیں حوصلہ دے رہے ہیں، کہ تمہیں دکھی یا غمگین ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ ہم نے اس قرآن میں کہا ہے، وہ اٹل ہے۔ وہ ہو کر رہے گا۔ جب ہم کہہ رہے ہیں کہ کفار ناکام ہونگے، تو ایسا ہی ہو گا اگر ہم کہہ رہے ہیں کہ مومنین کو اس دنیا اور آئندہ کی دنیا میں کامیابیاں اور سر فرازیاں ملیں گی، تو یہ بات بھی پوری ہو گی۔ کیونکہ ہم کوئی ایسی بات نہیں کرتے جو پوری نہ کی جاسکے۔

چنانچہ کلمات اللہ سے مراد وہ سارے وعدے، پیشن گوئیاں، یقین دہانیاں، اور راہنمائی ہے، جو اللہ کریم نے اس کتاب اللہ میں اپنے نبی ﷺ کو عطا فرمائیں، اور ان کی وساطت سے ہمیں ملیں۔

اب آتے ہیں "سنت اللہ" کی طرف۔۔ سب سے پہلے دیکھتے ہیں کہ سنت کسے کہتے ہیں۔ فرمایا۔

لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ ۖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ [١٥:١٣]

یہ لوگ اِس (قرآن) پر ایمان نہیں لائیں گے اور بیشک پہلوں کی (یہی) روش گزر چکی ہے،[طاہر القادری

یہ ہی کیفیت تمہاری قوم کی ہے۔ یہ بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ اور جو کچھ پہلے لوگ کرتے رہے ہیں وہی کچھ یہ بھی کرتے رہیں گے۔

مفہوم القرآن از جناب پرویزؒ

آیت بالا میں "سنت" کا درست مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ یعنی جو روش ان کے آباءواجداد کی تھی وہ ہی روش ان لوگوں کی ہے۔ چنانچہ "سنت اللہ" سے مراد، قانون ہرگز نہیں ہے۔

" سنت اللہ" سے مراد کسی مخصوص معاملہ میں اللہ کی روش، اللہ کا راستہ کہلائے گا، نہ کہ قانون۔

آیئے دیکھتے ہیں، قرآن کریم میں جہاں جہاں "سنت اللہ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، آیات کے سیاق و سباق میں، ان کا کیا مفہوم متعین ہوتا ہے۔

وَإِن كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا ۖ وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا [:]سُنَّةَ مَن قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِن رُّسُلِنَا ۖ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا [١٧:٧٧]

اور یہ لوگ اس بات پر بھی تلے رہے ہیں کہ تمہارے قدم اِس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھیر سکیں گے۔۔ یہ ہمارا مستقل طریق کار ہے جو اُن سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتا ہے جنہیں تم سے پہلے ہم نے بھیجا تھا، اور ہمارے طریق کار میں تم کوئی تغیر نہ پاؤ گے [ابوالاعلی مودودی]

لَّئِن لَّمْ يَنتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا [..]مَّلْعُونِينَ ۖ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا [:]سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا [٣٣:٦٢]

اگر منافقین، اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے، اور وہ جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں، اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کاروائی کرنے کے لیے تمہیں اُٹھا کھڑا کریں گے، پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمہارے ساتھ رہ سکیں گے، ان پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہو گی، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بُری طرح مارے جائیں گے، یہ اللہ کی سنت ہے جو ایسے لوگوں کے معاملے میں پہلے سے چلی آ رہی ہے، اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے [ابوالاعلی مودودی]

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا [:] سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلُ ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا [٤٨:٢٣]

یہ کافر لوگ اگر اِس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی و مددگار نہ پاتے، یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے [ابوالاعلی مودودی]

اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۚ فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۚ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا [٣٥:٤٣]

(انہوں نے) زمین میں اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھنا اور بری چالیں چلنا (اختیار کیا)، اور بُری چالیں اُسی چال چلنے والے کو ہی گھیر لیتی ہیں، سو یہ اگلے لوگوں کی رَوِشِ (عذاب) کے سوا (کسی اور چیز کے) منتظر نہیں ہیں۔ سو آپ اللہ کے دستور میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے، اور نہ ہی اللہ کے دستور میں ہرگز کوئی پھرنا پائیں گے،

[طاہر القادری]

فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ [:٠]فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ۖ سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ [٤٠:٨٥]

پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو کہنے لگے: ہم اللہ پر ایمان لائے جو یکتا ہے اور ہم نے اُن (سب) کا انکار کر دیا جنہیں ہم اس کا شریک ٹھہرایا کرتے تھے، پھر اُن کا ایمان لانا اُن کے کچھ کام نہ آیا جبکہ انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھ لیا تھا، اللہ کا (یہی) دستور ہے جو اُس کے بندوں میں گزرتا چلا آرہا ہے اور اس مقام پر کافروں نے (ہمیشہ) سخت نقصان اٹھایا، [طاہر القادری]

دوستو۔ بار بار ان آیات بالا کو پڑھیں، اس پر غور فرمائیں، ایک ایسا عمل ہے جس کے تناظر میں یہ ساری آیات مبارکہ نازل ہوئیں۔ اور وہ عمل ہے کسی بھی نبی کی قوم کا، اپنے نبی کو باتوں کو جھٹلانا۔ اپنے نبی کو ایذا پہنچانا۔ اپنے نبی کا انکار کرنا۔

دوبارہ غور فرمائیں، یہ ساری آیات صرف اور صرف اس مخصوص عمل کے حوالے سے نازل ہوئی ہیں اور اس مخصوص عمل کے حوالے سے اللہ کریم نے اپنی مخصوص روش کا ذکر کیا ہے، کسی خطہ زمین میں جب بھی وہاں کے لوگوں نے اللہ کے نبی کے ساتھ ایسا کیا، جو ان سے پہلے والی اقوام کرتی تھیں، یعنی نبی کی تضحیک، نبی کا انکار، نبی کو ایذا پہنچانا، وغیرہ تو اللہ کریم نے اس قوم کو تباہ و برباد کر دیا، اس کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

کہا کہ ہماری یہ روش شروع ہی سے چلی آرہی ہے، اب اگر تمہاری قوم نے بھی یہ ہی کچھ کیا، تو ان کے حوالے سے بھی ہماری یہ سنت جاری وساری ہے۔

یہ بھی برباد ہو جائیں گے۔ تم غم نہ کرو، تم پہلے نبی نہیں ہو جس کے ساتھ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

سوائے اس " مخصوص جرم " کے جو اقوام کرتی رہی تھیں، اور اس کے نتیجہ میں وہ قومیں برباد کر دی جاتی تھیں، اللہ کریم نے اپنے کسی عمل کو " سنت " نہیں کہا۔

اب اس آیت کا خصوصی تذکرہ کرنا لازم ہے، جسے جناب پرویزؒ نے، بطور دلیل پیش کیا ہے۔ ان ہی کے الفاظ دوبارہ پیش کرتا ہوں۔۔

" ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، کہ عالم خلق میں آکر " خدا کا امر " " قدر مقدور " ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ مقرر کردہ پیمانوں کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی کو قرآن میں " سنت اللہ " کہا گیا ہے۔ سورہ احزاب میں ہے۔ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا [۳۳:۳۸] خدا کی روش اقوام سابقہ کے بارے میں یہ ہی رہی ہے، یہ اس لیے کہ (عالم خلق میں) خدا کا امر پیمانوں کے ظروف میں ڈھل جاتا ہے ۔وہ غیر متبدل قانون کی شکل اختیار کر لیتا ہے "

کتاب التقدیر، صفحہ نمبر 44،43، از جناب پرویزؒ

اس ہی آیت مبارکہ کو جناب پرویزؒ نے پہلے " قدر " کے عنوان میں بطور دلیل پیش کیا تھا، جس کا جواب خاکسار نے دے دیا ہے۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ ایک بار پھر پوری آیت مبارکہ پیش کروں، پھر اس پر جناب پرویزؒ کے اپنے الفاظ میں، سچ بیان کر دوں۔ تاکہ قارئین کے ذہن میں بات واضح ہو جائے کہ کس

طرح، دانستہ طور پر، قرآن کریم کی آیات کو، ان کے سیاق وسباق سے الگ کر کے، اپنی مرضی اور منشاء کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ اللہ کریم پرویزؒ، کی غلطیوں پر، ان کی مغفرت کرے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَاهُ ۖ فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا [:] مَّا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ ۖ سُنَّةَ اللَّهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا [۳۳:۳۸]

اے نبیؐ، یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ "اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر" اُس وقت تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جسے اللہ کھولنا چاہتا تھا، تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو پھر جب زیدؓ اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملہ میں کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کا حکم تو عمل میں آنا ہی چاہیے تھا۔۔ نبی پر کسی ایسے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہو یہی اللہ کی سنت ان سب انبیاء کے معاملہ میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ کا حکم ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے [ابوالاعلیٰ مودودی]

آیت بالا پر غور فکر فرمائیں۔ یہ آیت مبارکہ کس مخصوص واقعہ کے تناظر میں نازل ہوئی ہے۔ اور اس آیت مبارکہ میں اللہ کریم اپنی جس سنت کا بیان فرمارہے ہیں، جس کے غیر متبدل ہونے کا اعلان بھی فرما رہے ہیں، کیا وہ "قانون" خداوندی کے طور پر، انسانی زندگی کے کسی دوسرے معاملے پر نافذ کیا جا سکتا ہے ؟

کیا اس سے کسی بھی واقعہ اور بات کو "سنت اللہ" کہہ کر اس پر "لا تبدیلا" کی مہر لگائی جا سکتی ہے ؟؟

اس موضوع پر "قدر" کے عنوان میں، اپنی معروضات پیش کر چکا ہوں۔

اس مقام پر زیادہ مناسب ہو گا کہ خود پرویز علیہ رحمہ کے اپنے الفاظ میں اس آیت مبارکہ کی حقیقی منظر کشی کر دوں۔ مفہوم القران میں اس آیت مبارکہ کے ضمن میں پرویزؒ فرماتے ہیں۔

" لیکن اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ اطاعت نظام خداوندی کی اطاعت ہے۔ اگرچہ اس نظام کے فیصلے رسول کی طرف سے صادر ہوتے ہیں اس سے رسول کی ذاتی اطاعت مقصود نہیں (3:78)، رسول کی ذاتی رائے یا مشورہ سے تمہیں اختلاف کا حق حاصل ہے۔ اس اختلاف کا نام "معصیت خدا اور رسول" نہیں ہو گا۔ اس باب میں زید کا واقعہ ایک بین مثال ہے۔ جسے اس نکتہ کی وضاحت کے لیے یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

زید پر اللہ کے بہت سے احسانات تھے۔ اور اے رسول تیرے ذاتی احسانات بھی بہت تھے۔ تو اس سے کہہ رہا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے نکاح میں رہنے دو۔ اور اس طرح قانون خداوندی کی رو سے تمہارا جو رشتہ قائم ہوا ہے، اس کی نگہداشت کرو۔ اگر تمہیں کوئی چھوٹی موٹی شکایت ہے تو اس سے درگذر کرو۔ اور اگر کوئی گہرا اختلاف ہے تو اسے بیان کرو اسے دل میں چھپائے رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اس لیے کہ اگر تم اسے اس وقت چھپائے بھی رکھو گے تو طلاق دینے کی صورت میں، قانون خداوندی کی رو سے اسے تمہیں

ظاہر کرنا ہی پڑے گا۔ یونہی طلاق نہیں دے دی جائے گی۔ تم لوگوں سے مت ڈرو، کہ وہ کیا کہیں گے، ڈرنے کا حق تو صرف قانون خداوندی سے ہے کہ اس کے خلاف کوئی بات نہ ہو جائے۔

لیکن زید نے تیرے مشورے کو نہ مانا۔ اور اپنی بیوی سے قطع تعلق کر لیا۔ اس کے بعد تم نے قانون خداوندی کے مطابق، اس کی مطلقہ بیوی سے شادی کر لی۔ تا کہ اسے اس حادثہ سے جو صدمہ پہنچا ہے اس کی تلافی ہو جائے۔ ہم نے اس باب میں واضح ہدایت نازل کر دی تھی۔ جب کہا تھا کہ منہ بولا بیٹا، حقیقی بیٹا نہیں بن جاتا (33:4)۔ نکاح حقیقی بیٹے سے جائز نہیں (4:23)۔ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ کا یہ عمل قانون خداوندی کے عین مطابق تھا۔

اس واقعہ سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ایک یہ کہ اطاعت ان ہی فیصلوں کی لازم ہے، جنہیں رسول نظام خداوندی کی طرف سے نافذ کرے۔ اس کی ذاتی رائے یا مشورے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، اور دوسرے یہ کہ ادعیار۔۔ منہ بولے بیٹے۔۔ حقیقی بیٹے نہیں بن جاتے۔

جو بات قانون خداوندی نے جائز قرار دے دی ہو، اس کے کر لینے میں نبی کے لے کوئی حرج نہیں۔ یہ قانون اس نبی کے لیے خصوصیت کے ساتھ نہیں بھیجا گیا، قانون خداوندی شروع سے ایسا ہی رہا ہے۔ اللہ کا قانون اس کی مشیت کی رو سے، مقرر شدہ پیمانوں کے مطابق بنتا ہے۔ ہنگامی حوادث سے متاثر ہو کر نہیں بنتا۔ اسی لیے غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔

مفہوم القرآن، از جناب پرویزؒ

یعنی منہ بولے بیٹے، حقیقی بیٹوں کا درجہ نہیں رکھتے۔ اللہ کی یہ سنت ہمیشہ سے ہے۔ غور فرمایا جائے کہ اللہ کس بات کو اپنی "سنت" کہہ رہا ہے۔

پرویزؒ کی اس ضمن میں مذکورہ بالا تحریر، اپنی زبان سے آپ، اپنی حقیقت کو آشکار کر رہی ہے۔ اس پر مزید کوئی تبصرہ بنتا ہی نہیں ہے۔

مدعی بھاری ہے خود تجھ پر گواہی تیری

حرف آخر

اللہ رب کریم، اس ساری کائنات کا مالک ہے۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ اس کے سامنے سر بسجود ہے۔ ساری کائنات اس ہی کی میراث ہے۔ پوری کائنات اس کے غلبہ و اقتدار کی مظہر ہے۔ وہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرنے کی طاقت و اختیار رکھتا ہے۔

اس نے اپنی قوت غالبہ اور حکمت بالغہ سے، اس ساری کائنات کو پیدا کیا۔ اس کے ایک ایک ذرے کو سنوارہ۔ اپنی مرضی و منشاء کے رنگ دیئے۔

ابتداء سے انتہا تک کے سارے مراحل کے "اندازے اور پیمانے" مقرر کیے۔ پھر اپنی مشیت کے مطابق اس میں اپنی مرضی کی مخلوق پیدا کی۔ ساری کی ساری مجبور محض۔ کائنات کا ہر ذرہ، مجبور محض، خدا کے طے کئے ہوئے راستے پر بغیر چوں چراں کیے، مصروف عمل۔۔۔۔۔

پھر اس رب نے اس کائنات میں اپنی منشاء کے مطابق ایک ایسی مخلوق، پیدا کی، جو اس کائنات کی دیگر ساری اشیاء، اور خلقت سے منفرد اور ممتاز حیثیت کی مالک تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انسان

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا فرمائی۔ ارادے کی طاقت دی۔ اپنی مرضی کے راستے کا انتخاب کرنے کی اجازت دی۔ ایک طبعی جسم دیا۔ اس جسم کو ایک ذات عطا فرمائی۔ "انسانی ذات"۔

انسان کی دو زندگیاں

اس بات کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ خدا نے انسان کا جسم تخلیق کیا۔ کائنات کی دیگر خلق کی طرح اس جسم کے "اندازے اور پیمانے" مقرر کیے۔ اس انسانی جسم میں اس کائنات کے سارے لوازمات موجود ہیں۔ ان پر اس کائنات کے "اندازے اور پیمانے" لاگو ہوتے ہیں۔ اس انسانی جسم کا تعلق خدا کے۔۔۔۔ " عالم خلق" سے ہے۔

پھر اس رب نے اس انسانی جسم کو اپنی حکمت سے ایک "ذات" عطا فرمائی۔ یاد رکھیے، انسان کی یہ ذات، تخلیق نہیں، بلکہ عطا کی گئی۔ اس بات کو بہت اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ تخلیق، کے معنی پہلے سے موجود مسالہ کو مختلف تناسب میں ملا کر، ایک نئی شئے بنانے کے ہیں۔ ان اشیاء کا تعلق، خدا کے "عالم خلق" سے ہوتا ہے۔ لیکن انسانی ذات اس "عالم خلق" کی مخلوق نہیں ہے۔ اس کا تعلق، خدا کے "عالم امر" سے ہے چنانچہ ارشاد فرمایا۔۔

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۖ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ [:]ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ [:]ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ ۖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ

[۳۲:۹]

جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی اُس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی۔۔ پھر اُس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے ، پھر اس کو نِک سُک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی، اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور دِل دیے تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو[ابوالاعلی مودودی]

" وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ" کے الفاظ بہت زیادہ توجہ کے طالب ہیں۔اس ہی بات کو دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا۔

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ [:]فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ [٣٨:٧٢]

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا" میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح بنادوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ"[ابوالاعلی مودودی]

اس جگہ "وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي " کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔"میری روح " کے الفاظ بہت زیادہ غور طلب ہیں۔کیا ہوتی ہے یہ روح؟ فرمایا

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا [١٧:٨٥]

اور یہ (کفّار) آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں، فرما دیجئے: روح میرے رب کے اَمر سے ہے اور تمہیں بہت ہی تھوڑا سا علم دیا گیا ہے،[طاہر القادری]

جیسے کہ ہم پہلے ہی خدا کے "عالم امر" کے متعلق بیان کر چکے ہیں کہ یہ وہ مقام ہے جہاں وہ رب اپنی مرضی و منشاء سے جو چاہے فیصلے کرتا ہے۔اس سے کسی شئے کا جواب طلب نہیں کیا جا سکتا۔ شعور کی موجودہ سطح پر جس طرح ہم اس "عالم امر" کے متعلق کچھ نہیں جانتے، ہم نہیں جانتے کہ وہ رب خود کیسا ہے، نہیں جانتے کہ اس کے ملائکہ کیسے ہیں۔ نہیں جانتے کہ جنت اور جہنم کیسے ہیں۔ نہیں جانتے کہ حیات بعد الممات کیسی ہو گی۔

بلکل اس ہی طرح ہم نہیں جانتے کہ انسان کے جسم میں پھونکی گئی، رب کریم کی وہ "روح" کیا شئے ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ جس طرح اللہ کے ملائکہ، اس کی جنت، جہنم، اس دنیا کے بعد کی دنیا، کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، بلکل اس ہی طرح، خود اپنے اندر موجود اس "ذات" کو بھی نہیں دیکھ پاتے۔ کیا خوب کہا ہے۔

وہ مجھ میں بولتا ہے، میں نہیں ہوں

تمہیں دھوکہ ہوا ہے میں نہیں ہوں

عبا پہنے ہوئے مٹی کی مورت

کوئی بہروپیا ہے، میں نہیں ہوں

اس ہی بات کو بابا بلھے شاہ نے ان الفاظ میں بیان کیا۔

وے بلھیا، اساں مرنا نہ ہی، گور پیا کوئی ہور

اس مقام پر یہ نقطہ بھی قابل غور ہے کہ رب کریم نے ملائکہ کو انسان کے "مادی جسم" کو سجدہ کرنے کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ اسے کہا کہ جب میں اس بشر میں اپنی روح کا شمہ پھونک دوں، تو تم اس کے آگے سر بسجود ہو جانا۔ ملائکہ کا سجدہ، آدم کے وجود خاکی کو نہ تھا۔۔

سجدہ تو صرف اس ذات باری تعالیٰ کو روا ہے۔

کیا معاذ اللہ، وہ خدا خود اپنے ملائکہ سے شرک کا مطالبہ کر رہا تھا؟؟

سجدہ تو اس رب ذوالجلال کی عطا کی ہوئی "ذات" کو تھا۔ جسے وہ اپنی روح کہہ رہا ہے۔

یہ وجہ تھی کہ جب ابلیس نے آدم کو اس بناء پر سجدہ کرنے سے انکار کر دیا کہ اس کی تخلیق، خاک سے ہوئی ہے تو یہ ہی اس کی کوتاہ بینی تھی۔ یہ ہی اس کے رانگاہ درگاہ بننے کا سبب بنی۔

ہم پہلے ہی اس موضوع پر بات کر چکے ہیں کہ خدا کا "عالم امر" کیا ہوتا ہے۔ میں نے اسے "صدر مقام" سے تشبیہ دی ہے۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں اللہ کریم اپنی مرضی و منشاء سے، جس طرح چاہتا ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اپنے حکم کی تعمیل کے لیے وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ صرف "کُن" کہتا ہے۔ اور "فیکون"، ہو جاتا ہے۔

انسانی جسم کی پرورش رحم مادر میں، عام جانداروں کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں وہ سارے لوازمات ہوتے ہیں، جو اس زمین میں موجود ہیں۔ لیکن ایک مقام پر آکر وہ رب اس "مادی جسم" میں اپنی توانائی کا ایک شمہ پھونک دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ، انسان کا "مادی جسم"، حیوانی سطح سے بلند ہو کر، علیٰ حد بشریت، صفات خداوندی کا حامل ہو جاتا ہے۔

اس "مادی جسم" میں ایک اور انسان جنم لے لیتا ہے۔ اللہ کریم اسے "نفس" کہتے ہیں۔ ہماری عام زبان میں اسے " روح" کہتے ہیں۔ یہ "انسانی ذات "ہوتی ہے، جس کا تعلق خدا کے "عالم امر "سے ہے۔ اس پر اس "مادی دنیا" کا کوئی "اندازہ یا پیمانہ "لاگو نہیں ہوتا۔ اس جہت سے یہ انسان، اس دنیا میں دو طرح کی زندگی گزارتا ہے۔

ایک اس کی "مادی "زندگی ہوتی ہے۔

جس طرح اللہ کریم نے کائنات کی دیگر اشیاء کے "اندازے اور پیمانے "مقرر کیے ہوئے ہیں، اس ہی طرح، انسان کے اس "مادی جسم "کے لئے بھی "اندازے اور پیمانے "مقرر ہیں۔ انسانی جسم اس کائنات کے مقرر کردہ "اندازوں اور پیمانوں "کے مطابق، پھلتا پھولتا ہے۔ بچپن، جوانی، بڑھاپا، اور بالآخر۔۔۔۔

موت!!!

جب کہ دوسری زندگی، "انسانی ذات" کی زندگی ہے "انسانی ذات"، غیر نشوونما حالت میں عطا کی جاتی ہے۔ یہ زندگی خدا کے مقرر کیے ہوئے ابدی قوانین کے ماتحت ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ ہی وہ قوانین ہیں، جو غیر متبدل ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا [:]وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا [۹۱:۱۰]

بیشک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو (رذائل سے) پاک کر لیا (اور اس میں نیکی کی نشوونما کی)، اور بیشک وہ شخص نامراد ہو گیا جس نے اسے (گناہوں میں) ملوث کر لیا (اور نیکی کو دبا دیا)، [طاہر القادری]

اس دنیا میں انسان کا مقصد حیات یہ ہی ہے کہ وہ اپنی ذات کی نشوونما کرے۔ تا کہ انسانی ذات اس دنیا کے بعد والی دنیا کے مراحل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ انسانی ذات کی اس نشوونما کے لیے، اسے یہ مادی جسم ملا، تا کہ وہ ان مراحل سے اپنے رب کی عطا کی ہوئی راہنمائی میں، سفر کرتا ہوا، اپنی ذات کی اتنی نشوونما کر لے، کہ اسے اس مادی جسم کی ضرورت نہ رہے۔

قرآن کریم نے انسانی ذات کی نشوونما کی انتہا کو ان مسحور کن الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد فرمایا۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ [:]ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً [:]فَادْخُلِي فِي عِبَادِي [:]وَادْخُلِي جَنَّتِي [۸۹:۳۰]

(دوسری طرف ارشاد ہو گا) اے نفس مطمئن! چل اپنے رب کی طرف، اِس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے، شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں، اور داخل ہو جا میری جنت میں

[ابوالاعلی مودودی]

اس مقصد کے حصول کے لیے اس "انسانی ذات" نے اپنے "مادی جسم" کے توسط سے وہ کام کرنے ہیں، جو اس کی نشوونما میں فعال کردار ادا کر سکیں۔ انسان کا "مادی جسم" اس "عالم خلق" کا ایک حصہ ہے، چنانچہ وہ ان تمام "اندازوں اور پیمانوں" کا ماتحت ہے، جو رب کریم نے اس کائنات کے ہر ذرے کے لیے مقرر کیے ہیں۔ چونکہ انسانی جسم نے اللہ کریم کے مقرر کردہ "اندازوں اور پیمانوں" کے مطابق، عمل کرتے ہوئے، اپنی "ذات" کی نشوونما کرنی ہے، اس لیے لازم تھا کہ۔۔۔۔۔ اس "مادی دنیا" کے مقرر کردہ "اندازوں اور پیمانوں" کو انسان کے ماتحت کر دیا جاتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے، اس رب کائنات نے اپنے مقرر کردہ ان "اندازوں اور پیمانوں" کو اٹل بنا دیا۔

لیکن غیر متبدل ہرگز نہیں۔

اس بات کو اس مثال سے سمجھتے ہیں۔ اللہ کریم نے پانی کا ایک "اندازہ یا پیمانہ" یہ مقرر کیا کہ، عام سیال حالت میں یہ نشیب کی طرف بہے گا۔ اب اللہ کریم کا مقرر کردہ یہ "اندازہ یا پیمانہ" اٹل ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا کہ پانی عام سیال حالت میں، نشیب کی طرف نہ جائے۔ لیکن اس رب نے اس پانی ہی کا ایک اور "اندازہ یا پیمانہ" مقرر فرمایا۔ جس کی رو سے اگر انسان چاہے، تو اپنی منفعت کے لیے، خدا کے مقرر کردہ اس "اندازے یا پیمانے" کو تبدیل کر لے۔

چنانچہ آج یہ انسان اس بات پر قادر ہے کہ وہ جب چاہے، انگلی کے ایک اشارے سے کسی پمپ کے ذریعے، اس ہی سیال پانی کو ہزاروں فٹ بلندی کی طرف رواں دواں کر سکتا ہے۔

اس ہی طرح باقی ساری کائنات کے "اندازے اور پیمانے" انسان کے تابع و محکوم ہیں۔

انسان اپنے رب کی عطا کردہ صلاحیت کی بنیاد پر، ان ہی اشیاء کائنات کے دیگر "اندازوں اور پیمانوں" کو دریافت کر کے، اس سے اپنی مرضی و منشاء کے فوائد حاصل کر سکتا ہے، اور اس طرح اپنی "انسانی ذات" کی نشوونما بھی کرتا ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ رب جو دنیا کی ہر شئے کا مالک و خالق ہے، مقتدر ہے، اگر اس کی پیدا کی ہوئی ایک مخلوق اپنی مرضی سے جب چاہے، اس خدا کے مقرر کردہ "اندازے یا پیمانے" کو بدل سکتی ہے، تو کیا وہ خدا خود اس بات پر قادر نہیں ہو سکتا؟؟

کیا وہ خدا اپنی کائنات اور اس میں بسنے والی اپنی مخلوق کے لیے، اگر کسی مقام پر مناسب سمجھے کہ فلاں شئے کا مقرر شدہ "اندازہ یا پیمانہ" تبدیل کرنا چاہیے تو اس کے لیے یہ بات کس طرح ناممکن ہے؟؟

کس طرح خدا کا یہ عمل، قانون شکنی کے زمرے میں آسکتا ہے؟

یہ دلیل کہ خدا کسی کام کے، کر سکنے کی طاقت و قدرت ہونے کے باوجود نہیں کرتا، کس طرح ایک قانون میں تبدیل ہو سکتی ہے کہ وہ خدا کبھی بھی ایسا نہیں کرے گا؟؟

اپنی مرضی و منشاء سے کوئی کام ایک طویل مدت تک نہ کرنے کا عمل، اس بات کا جواز کس طرح بن سکتا ہے کہ وہ کام کبھی بھی نہیں کیا جائے گا؟؟

خدائے علیم و خبیر نے یہ کائنات ایک مدت متعین تک کے لیے پیدا فرمائی۔ اس کائنات کا سارا نظام اس خالق و مالک کے مقرر کردہ "اندازوں اور پیمانوں" کے مطابق مصروف عمل ہے۔ خارجی کائنات میں سارا نظم و نسق، اس خدا بزرگ و برتر کے مقرر کردہ "اندازوں اور پیمانوں" کے مطابق چل رہا ہے۔ سورج روزانہ مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔

یہ سارے فضائی کرے، اپنے اپنے مدار میں، اپنی مخصوص رفتار سے چلے جا رہے ہیں۔ صدیاں گزر گئیں، اور رب کائنات نے ان "اندازوں اور پیمانوں" میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

لیکن کیا کسی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب ہے کہ۔۔۔

جس دن اس کائنات کی وہ معین معیاد پوری ہو جائے گی، جس دن خداوند قدوس اس کائنات کو فنا کرنے کا ارادہ فرمائیں گے، کیا ان مقرر کردہ "اندازوں اور پیمانوں" میں تبدیلی کے بغیر یہ عمل مکمل ہو سکے گا؟؟

کیا وہ خدا اس وقت اپنے مقرر کردہ ان "اندازوں اور پیمانوں" کو تبدیل نہیں کرے گا؟؟

فنا کا یہ عمل، کیا کسی "اندازے اور پیمانے" سے بالاتر ہو گا؟؟

معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، ایک مجبور و مھجور خدا، کس طرح فنا کے اس عمل کو برپا کرے گا؟؟

قانون مکافات عمل

اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں ایک قانون بیان فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللَّهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِم مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِن دَابَّةٍ وَلَٰكِن يُؤَخِّرُهُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ [١٦:٦١]

اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کے عوض (فوراً) پکڑ لیا کرتا تو اس (زمین) پر کسی جاندار کو نہ چھوڑتا لیکن وہ انہیں مقررہ میعاد تک مہلت دیتا ہے، پھر جب ان کا مقررہ وقت آپہنچتا ہے تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں، [طاہر القادری]

آیت بالا، رب کریم کے مقرر کردہ ایک قانون کو بیان کر رہی ہے۔ انسان کے عمل اور اس کے نتیجے میں ایک مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ وہ خدا اپنے بندوں پر بے انتہا مہربان ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسان اپنے فیصلے کی غلطی کی وجہ سے ایسے اعمال کا مرتکب بھی ہو سکتا ہے، جس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہے۔ اگر انسانی عمل کا نتیجہ فوراً سامنے آجائے، تو روئے زمین پر ایک متنفس بھی باقی نہ بچے۔ چنانچہ اس نے انسان کے ہر عمل اور اس کے نتیجہ میں ایک وقفہ رکھ دیا، تاکہ اگر انسان نادانستگی میں کوئی غلط عمل کر بیٹھے، تو اس کا ازالہ کر سکے۔

اب آپ عملی دنیا میں دیکھیں، کیا ہوتا ہے؟

اگر کوئی انسان آگ میں انگلی ڈال دے، تو کیا ہوتا ہے؟

کتنی دیر میں اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے؟

کیا ایک لمحہ کی مہلت بھی ملتی ہے؟

تو معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، ہم یہ کہیں کہ وہ خدا اپنے وعدوں کا پکا نہیں ہے۔ یا وہ خدا ایک وقت میں دو متضاد باتیں کر رہا ہے۔ یا یہ کہ معاذ اللہ، وہ خدا اپنے بندوں کو دھوکہ دے رہا ہے؟

کیا اس ذات باری تعالیٰ کے متعلق، اس طرح کا کوئی وسوسہ بھی، تصور میں لایا جا سکتا ہے؟؟

یہ ہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے بہت سارے محترم اکابرین کرام نے دھوکہ کھایا ہے۔ ہمارے ان محترم بزرگوں نے، انسان کے "مادی جسم" اور "انسانی ذات" کے قوانین کو گُڈ مُڈ کر دیا۔ وہ اس تفریق کو نہ سمجھ سکے، کہ آگ کا کام جلانا ہے، یہ اس مادی دنیا میں، خدا کا مقرر کردہ "اندازہ و پیمانہ" ہے۔ اگر انسان آگ کے اس مقرر کردہ "اندازے و پیمانے" کو تبدیل کرنا چاہتا ہے تو اس کا انتظام کرے، تاکہ آگ سے بچ جائے، ورنہ یہ آگ اسے لمحوں میں جلا دے گی۔ کوئی مہلت نہ ملے گی۔

لیکن مہلت کے وقفے کا "قانون" اس طبعی دنیا سے متعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق "انسانی ذات" سے ہے خدا کا مقرر کردہ یہ "قانون" غیر متبدل ہے۔ اس قانون میں، انسان کے ان ہی اعمال کی گرفت ہوتی ہے جو وہ اپنے دل کے ارادے سے کرے۔ زبردستی یا مجبوری میں کیا ہوا کوئی عمل، قابل مواخذہ نہ ہو گا۔ اب یہ عین ممکن ہے کہ انسان کوئی عمل اپنے دل کی کامل رضامندی سے کرے۔ اپنی فہم سے درست سمجھ کر کرے، لیکن عمل کے بعد اسے اس بات کا احساس ہو جائے، کہ غلطی ہو گئی ہے۔

اس مقام پر اس رب کی صفت رحمانی اور رحیمی کا ظہور ہو تا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو کہتا ہے۔۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ [:]وَأَنِيبُوا إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ [٣٩:٥٤]

(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے، وہ تو غفور و رحیم ہے، پلٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور مطیع بن جاؤ اُس کے قبل اِس کے کہ تم پر عذاب آ جائے اور پھر کہیں سے تمہیں مدد نہ مل سکے

[ابوالاعلی مودودی]

اس کا طریقہ بھی وہ بتاتا ہے کہ ایک اور "قانون" خداوندی ہے۔ جس پر مہلت کے اس عرصہ میں کہ جب تمہارے غلط عمل کا نتیجہ ہنوز سامنے نہیں آیا، عمل کرنے سے تمہارے غلط عمل کے نقصان کا ازالہ ہو جائے گا۔ چنانچہ فرمایا۔۔

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ۚ ذَٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ [١١:١١٤]

بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ یہ نصیحت قبول کرنے والوں کے لئے نصیحت ہے، [طاہر القادری]

کیونکہ انسان کی جنت و جہنم کا فیصلہ، انسانی اعمال کے وزن کے مطابق ہو گا۔ ارشاد فرمایا۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ ۚ فَمَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ [:]وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُم بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ [٧:٩]

اور اس دن (اعمال کا) تولا جانا حق ہے، سو جن کے (نیکیوں کے) پلڑے بھاری ہوں گے تو وہی لوگ کامیاب ہوں گے، اور جن کے (نیکیوں کے) پلڑے ہلکے ہوں گے تو یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو نقصان پہنچایا، اس وجہ سے کہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے، [طاہر القادری]

ایسا ہر گز نہ ہو گا کہ جو لوگ جنت میں جائیں گے، انہوں نے زندگی میں کبھی بھی کوئی گناہ نہ کیا ہو گا۔ ہاں ان کے اچھے اعمال کا وزن ان کے برے اعمال کے وزن کے مقابلے میں زیادہ ہو گا، چنانچہ اللہ کریم انہیں جنت عطا فرما دیں۔ اور یہ لوگ اپنی کچھ گناہوں کے ساتھ ہی جنت میں جائیں گے۔۔

بلکل اس ہی طرح، وہ لوگ جنہیں جہنم ملے گا، ایسا نہ ہو گا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کوئی بھی اچھا کام نہ کیا ہو گا۔ ہاں، ان کے برے اعمال کا وزن، ان کے اچھے اعمال کی نسبت، زیادہ ہو گا۔ چنانچہ یہ لوگ، اپنے کچھ اچھے اعمال کے باوجود بھی، ان ہی کے ساتھ جہنم میں چلے جائیں گے۔

انسان کے اپنے ارادے اور رضا کے ساتھ کئے ہوئے اچھے اعمال، ان غلط اعمال کے برے نتائج کے نقصانات سے بچا دیتے ہیں۔

چنانچہ قرآن کریم میں اگر کوئی "قانون" بیان ہوا ہے، تو وہ "قانون مکافات عمل" ہے۔

ناقابل تغیر، غیر متبدل۔

" سنت اللہ " بھی خدا کے " قانون مکافات عمل " کا ایک حصہ ہے۔ انسانوں کے اعمال کا نتیجہ۔ اس ہی لیے اللہ کریم نے اسے بھی غیر متبدل کہا ہے۔

اشیاء کائنات کے مقرر کردہ " اندازے اور پیمانے " قانون کے دائرے میں نہیں آتے۔ اس ہی لیے یہ تغیر پذیر ہیں۔ تبدل و تحول پذیر ہیں۔ بد قسمتی سے ہر دور کا انسان اپنے دور کی علمی ترقی، اور مشاہدات کے بناء پر یہ سمجھ لیتا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے بس یہ ہی قانون خداوندی ہے۔ غیر متبدل ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔

سائنس ہر گزرتے لمحے میں، ان اشیاء کائنات کے نت نئے " اندازوں اور پیمانوں " کو دریافت کر رہی ہے۔ ترقی کا یہ عمل، جاری و ساری ہے۔ کسی بھی دور کا انسان اس بات کا دعوے دار نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ اس کا مشاہدہ ہے، یہ ہی قانون خداوندی ہے۔ غیر متبدل ہے۔ یہ بہت بڑی کوتاہ بینی ہے۔ فہم کی کمی ہے۔

اس ضمن میں حرف آخر کے طور پر قرآن کریم کی وہ آیت مبارکہ پیش کرتا ہوں، جو اس سارے مضمون کا ملخص ہے۔ اس آیت مبارکہ کا مفہوم بھی پرویز علیہ رحمہ کی زبانی پیش کرتا ہوں۔ اور پھر ایک سوال قارئین کے لیے چھوڑ دیتا ہوں کہ اس قدر واضح اور روشن آیت مبارکہ کی موجودگی میں، پرویز علیہ رحمہ نے اللہ کریم کے مقرر کردہ " اندازوں اور پیمانوں " کو قانون کا درجہ دے کر، انہیں غیر متبدل کیسے قرار دے دیا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ

[:]ذَٰلِكَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ [٣٢:٦]

کائنات کو مختلف ادوار و مراحل سے گزار کر، پیدا کرنے سے کیا مراد ہے۔ اسے غور سے سنو، اس کا طریقہ تخلیق یہ ہے کہ اس کے عالم مشیت میں، ایک اسکیم سامنے آتی ہے۔ وہ اس اسکیم کا آغاز اس کے پست ترین نقطہ سے کرتا ہے، اور وہ کائناتی عناصر کے باہمی تعاون سے نشوونما پاتی ہوئی، ارتقائی منازل طے کرتی جاتی ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ اس نقطہ تکمیل کی طرف اٹھتی اور بڑھتی جاتی ہے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کیا تھا(35:10)ان ارتقائی منازل کی مدت تمہارے حساب و شمار کے مطابق، ہزار ہزار سال(22:47)بلکہ بعض اسکیموں کے سلسلے میں پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے(70:4)

یہ سلسلہ تخلیق و ارتقاء اس خدا کی طرف سے کارفرما ہے، جو ہر شئے کی مضمر ممکنات سے بھی واقف ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہے کہ ان میں سے کیا کچھ مشہود ہو چکا ہے۔ اور کتنا ہنوز باقی ہے۔ یہ سب کچھ اس قانون خداوندی کی رو سے ہوتا ہے، جو تمام اسکیموں کو مناسب نشوونما دے کر انہیں تکمیل تک پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے۔

مفہوم القرآن از جناب پرویزؒ

"ان میں سے کیا کچھ مشہود ہو چکا ہے۔ اور کتنا ہنوز باقی ہے" یہ چند الفاظ حاصل مضمون ہیں، لیکن۔۔۔۔۔۔۔

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

(إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون)